جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ
# ترجمان القرآن

كلوا من الطيبات واعملوا صالحا

مدیر
پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ
# ترجمان القرآن

جلد ۱۲۷، عدد ۹، ستمبر ۲۰۰۰ء، جمادی الثانی ۱۴۲۱ھ

مدیر: پروفیسر خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

## ترتیب



ادارتی امور
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور
فون: ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴ (۰۴۲)

مدیر انتظامی
عبدالکریم
۵- اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)
فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)

☆

ویب سائٹ
www.tarjumanulquran.com
ای- میل
tarjuman@pol.com.pk

☆

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے
زر سالانہ: ۲۰۰ روپے

بھارت ۳۵۰ روپے
بنگلہ دیش، ایران ۵۰۰ روپے
مشرق وسطیٰ، یورپ،
مشرق بعید، افریقہ ۷۰۰ روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۵۰ روپے

# فرقہ بندی

مسلمانوں میں نماز پڑھنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک شخص سینے پر ہاتھ باندھتا ہے' دوسرا ناف پر باندھتا ہے۔ ایک شخص امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتا ہے' دوسرا نہیں پڑھتا۔ ایک شخص آمین زور سے کہتا ہے' دوسرا آہستہ کہتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص جس طریقے پر چل رہا ہے' یہی سمجھ کر چل رہا ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ اس لیے نماز کی صورتیں مختلف ہونے کے باوجود دونوں حضورؐ ہی کے پیرو ہیں۔ مگر جن ظالموں نے شریعت کے ان مسائل کو دین سمجھ رکھا ہے انھوں نے محض ان ہی طریقوں کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھ لیا' اپنی جماعتیں الگ کر لیں' اپنی مسجدیں الگ کر لیں۔ ایک نے دوسرے کو گالیاں دیں' مسجدوں سے مار مار کر نکال دیا' مقدمے بازیاں کیں' پارٹی بندیاں کیں' اور رسولؐ اللہ کی امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

اس سے بھی لڑنے اور لڑانے والوں کے دل ٹھنڈے نہ ہوئے' تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک نے دوسرے کو کافر اور فاسق اور گمراہ کہنا شروع کر دیا۔ ایک شخص قرآن سے یا حدیث سے ایک بات اپنی سمجھ کے مطابق نکالتا ہے' تو وہ اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے اس پر عمل کرے' بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ دوسروں سے بھی اپنی سمجھ زبردستی تسلیم کرائے' اور اگر وہ اسے تسلیم نہ کرے تو ان کو خدا کے دین سے خارج کر دے۔

آپ مسلمانوں میں حنفی' شافعی' اہل حدیث وغیرہ جو مختلف مذہب دیکھ رہے ہیں' یہ سب قرآن و حدیث کو آخری سند مانتے ہیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق وہیں سے احکام نکالتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کی سمجھ صحیح ہو اور دوسرے کی سمجھ غلط---- لیکن کسی شخص کی سمجھ کا غلط ہونا اور بات ہے اور اس کا دین سے خارج ہونا دوسری بات۔ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق شریعت پر عمل کرنے کا ہر مسلمان کو حق ہے۔ اگر ۱۰ مسلمان ۱۰ مختلف طریقوں پر عمل کریں' تو جب تک وہ شریعت کو مانتے ہیں' وہ سب مسلمان ہی ہیں' ایک ہی امت ہیں' ان کی جماعتیں الگ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر جو لوگ اس چیز کو نہیں سمجھتے وہ انھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر فرقے بناتے ہیں' ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں' اپنی نمازیں اور مسجدیں الگ کر لیتے ہیں' ایک دوسرے سے شادی بیاہ' میل جول اور ربط و ضبط بند کر دیتے ہیں' اور اپنے اپنے ہم مذہبوں کے جتھے اس طرح بنا لیتے ہیں کہ گویا ہر جتھہ ایک الگ امت ہے (''دین اور شریعت'' ابوالاعلیٰ مودودی' جلد ۱۷' عدد ۱' ۲' ۳' رجب' شعبان' رمضان ۱۳۵۹ھ ' ستمبر' اکتوبر' نومبر ۱۹۴۰ء' ص ۸۰-۸۱)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

# کشمیر---اصل مسئلہ' حقیقی چیلنج!

## پروفیسر خورشید احمد

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی امتیازی شان ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ لیکن آج امت کا یہ حال ہے' اور خصوصیت سے پاکستان کے ارباب اختیار کا' کہ قوت ایمانی کی کمی اور مومنانہ فراست سے محرومی کے باعث ایک ہی سوراخ سے دو بار نہیں' بار بار ڈسے جا رہے ہیں اور پھر اسی سوراخ کے گرد منڈلاتے اور اس کی قدم بوسی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ بات محض استعارے کی نہیں ایک دردناک حقیقت ہے۔

کشمیر کے مسئلے کو لیجیے جو پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے' اور جسے قائداعظمؒ نے وطن عزیز کی شہ رگ قرار دیا تھا لیکن بھارت ہو یا امریکہ' دونوں سے بار بار چوٹ کھانے اور دھوکے پر دھوکا کھانے کے باوجود ہماری قیادتیں "طواف کوے ملامت" سے باز رہنے کو تیار نہیں۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ بندی سے کارگل ۱۹۹۹ء کے سانحے تک کسی واقعے سے بھی سبق سیکھنے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ سیاسی سربراہان مملکت میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے جو چرکے کھائے اور زخم دیے وہ مملکت کے جسم پر رستے ہوئے ناسور کی شکل میں موجود ہیں لیکن موجودہ قیادت نے ان سے کوئی عبرت نہیں پکڑی۔ جو خطرناک کھیل اس وقت کھیلا جا رہا ہے اس کے پردۂ زنگاری میں موجودہ حکمرانوں اور ان ایجنسیوں کا پرتو بھی دیکھا جا سکتا ہے جو دراصل مملکت کی حفاظت پر مامور ہیں اور جن کا کام اس کو درپیش ہر خطرے کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اور دشمن کا منہ توڑنا ہے' نہ کہ اس کھیل میں شریک ہو جانا جو ہمیں کمزور کرنے بلکہ پابہ زنجیر کرنے کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔

ان حالات میں ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے' اور وہ ہے ملک کے عوام کو بیدار کرنا' ان کو حقائق

سے آگاہ کرنا اور اصل خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر کرنا تاکہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ان کے آگے ڈٹ جائیں۔

---

۲۴ جولائی ۲۰۰۰ء کو جو دھماکا حزب المجاہدین کی طرف سے یک طرفہ جنگ بندی کی شکل میں ہوا، وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ ۴ جولائی ۱۹۹۹ء کے اعلان واشنگٹن سے لے کر آج تک رونما ہونے والے واقعات کا اگر تجزیہ کیا جائے اور کڑی سے کڑی ملا کر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ امریکہ اور بھارت (نیز اسرائیل) کی ملی بھگت سے کشمیر کے مسئلے کی تحلیل (liquidation) اور تحریک آزادی کو سبوتاژ کرنے کا منصوبہ ایک خاص تدریج سے روبہ عمل ہے۔ افسوس کہ ان مجاہدوں کے کچھ قائد بھی اس جال (trap) میں پھنس گئے جو عالمی شاطر اور بھارتی سامراج ان کے لیے بن رہا تھا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل، تحریک اسلامی کی بروقت اور دوٹوک تنبیہہ اور ان معصوم جوانوں کے خلوص اور خون کی دہائی تھی کہ حزب المجاہدین دو ہفتے ہی میں اس جال سے نکل آئی، جنگ بندی کو ختم کر دیا اور جہاد میں پھر سرگرم عمل ہو گئی۔ اس پورے عمل میں بھارت کا اصل چہرہ اور حقیقی عزائم پوری دنیا کے سامنے ایک بار پھر کھل کر سامنے آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لغزش اور اس سے پیدا ہونے والے شر سے اس عظیم جہادی تحریک کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھا بلکہ اس کی اس لغزش سے یہ خیر رونما ہوا کہ ایک طرف تحریک اسلامی کا موقف اور جہاد سے اس کا پختہ عہد (commitment) کھل کر سامنے آگیا تو دوسری طرف خود دشمن کے منہ سے بار بار یہ اعتراف ریکارڈ پر آگیا کہ کشمیر کی تحریک مزاحمت ایک خالص کشمیری تحریک ہے اور حزب المجاہدین کی عظیم اکثریت مقبوضہ کشمیر کے مجاہدوں پر مشتمل ہے جو بھارت کی غلامی سے نجات کے لیے جہاد کر رہی ہے۔ مسئلے کے حل کی راہ میں اصل رکاوٹ بھارت کے سامراجی عزائم، ریاستی تشدد اور ظلم، بین الاقوامی معاہدات کی خلاف ورزی اور میکاولین سیاست ہے جس کا پوری دنیا نے ان دو ہفتوں میں ایک بار پھر مشاہدہ کر لیا (وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ج (ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ البقرہ ۲: ۲۱۶)۔

گذشتہ چند ہفتوں میں عالمی سطح پر کشمیر کے مسئلے کی جو تشہیر ہوئی ہے اور خود بھارت کے دانش ور، اہل قلم اور صحافی جن حقیقتوں کا اب اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، اس نے بھارت کی قیادت کو مدافعت پر مجبور کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ پاکستان کی وزارت خارجہ اور وزارت اطلاعات اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہی۔ وہ ایک عالم گیر سفارتی مہم کے ذریعے اس مسئلے کی حقیقت سے دنیا کو روشناس کر کے تحریک مزاحمت کے حق میں عالمی رائے کو مسخر کر سکتی تھی لیکن اس کا کوئی نشان نظر نہیں آرہا۔ بلکہ ایک

خاص گروہ اس بات کی کوشش کر رہا ہے، خصوصیت سے انگریزی اخبارات میں، کہ تحریک جہاد کو ایک "سعی لاحاصل" اور محض "مذہبی بنیاد پرستوں کی کارگزاری" بنا کر پیش کرے اور معاشی حالات کا سہارا لے کر امن اور صلح کے نام پر کشمیر کے مسئلے کو ایک بار پھر اس تابوت میں بند کر دے جس سے ۱۲ سالہ قبل تحریک جہاد نے اسے نکالا اور ایک زندہ حقیقت بنا دیا تھا۔

---

بھارت تحریک مزاحمت کو ننگی طاقت سے کچلنے میں ناکام ہونے کے بعد جس حکمت عملی پر کام کر رہا ہے، اس کے چھے اجزا ہیں:

۱- پاکستان کو کشمیر کے مسئلے سے نہ صرف یہ کہ غیر متعلق کر دے بلکہ تحریک مزاحمت کو محض پاکستان کا شاخسانہ بنا کر پیش کرے اور اس کے خلاف تشدد اور دہشت گردی کے الزامات اس شدومد سے لگائے کہ پاکستان دفاعی پوزیشن میں آجائے اور عالمی سطح پر اسے الگ تھلگ (isolate) کر دیا جائے۔

۲- تحریک مزاحمت کو تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ نہ صرف یہ کہ تحریک کمزور ہو، بلکہ آپس میں دست و گریبان ہو جائے اور اس طرح اصل دشمن کو ہدف بنانے کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف سرگرم ہو جائے۔

۳- تحریک جہاد اور سیاسی محاذ میں (جس کی نمایندگی حریت کانفرنس کر رہی ہے) بعد، بے اعتمادی اور تصادم کی کیفیت پیدا کی جائے۔ اس سلسلے میں جہادی تحریکوں پر بھی کام ہو رہا ہے اور حریت کانفرنس میں شریک جماعتوں اور قائدین پر بھی، تاکہ بھانت بھانت کی بولیاں سیاسی فضا کو مکدر اور غیر مؤثر کر دیں۔

۴- بھارت کے چنگل سے آزادی کی تحریک کو خود مختاری (autonomy) اور علاقائی بنیادوں پر اختیارات کی تقسیم اور منتقلی (regional devolution) سے الجھا دیا جائے اور اس طرح کا کوئی ڈراما رچایا جائے جیسا ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں کیا گیا تھا اور جس کا حشر اہل جموں و کشمیر گذشتہ ۵۰ سال میں بہ چشم سر دیکھ چکے ہیں۔

۵- اس سب کے پیچھے اصل منصوبہ تقسیم کشمیر کا ہے جس کے لیے بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے کام ہو رہا ہے، جس کا مقصد مقبوضہ جموں کشمیر کو تین حصوں میں--- مسلم اکثریت کی کشمیر کی وادی اور ڈوڈہ، پونچھ، راجوری اور کارگل کا علاقہ، جموں کا ہندو / ڈوگرہ اکثریت کا علاقہ اور لیہہ (Leh) کا بدھ اکثریت کا علاقہ--- بانٹنا ہے۔ اس نقشے میں رنگ بھرنے کے لیے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو لڑانے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں جن کا آغاز ۱۹۹۰ء میں لداخ میں مسلمانوں کے خلاف کارروائی سے ہوا اور جن میں اب سکھوں، ہندو یاتریوں، پنڈتوں کے خلاف کارروائیاں اور بارڈر کے علاقوں سے مسلمانوں کا انخلا اور بھارت کے ہندوؤں کو لا کر آباد کرنا شامل ہیں۔ یہ بالکل اسی نقشے پر کام ہو رہا ہے جس پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۷

تک غیر منقسم ہندستان میں ہوا تھا۔ یعنی بہار، بنگال اور پنجاب کے خونی فسادات کے ذریعے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا منصوبہ پورا کیا گیا۔

۶- اس نقشے کا آخری حصہ کنٹرول لائن کو معمولی رد و بدل کے ساتھ بین الاقوامی سرحد بنانا اور اس طرح کشمیر کی تقسیم در تقسیم کے ذریعے اس مسئلے کو دفن کر دینا ہے۔

یہ بھی اس منصوبے کا حصہ ہے کہ سہ فریقی مذاکرات اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے فریم ورک میں مسئلے کے حل سے احتراز کیا جائے اور دو فریقی سلسلہ جنبانی کے ذریعے بھارت اور کشمیریوں میں معاملات طے کرنے کی کوشش کی جائے، اور پھر ایک امر واقعہ (fait accompli) کی حیثیت سے بھارت اور پاکستان سے اسے قبول کرایا جائے۔ امریکہ کھل کر سامنے نہیں آرہا، لیکن یہ سارا کھیل اس کے اشارے پر اور اس کے دیے ہوئے نقشے کے مطابق کھیلا جا رہا ہے۔ پاکستان پر اتنا معاشی اور سیاسی دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ چاروناچار اس میں شریک ہو جائے۔ یہ ساری کارروائی اوسلو معاہدے کے طرز پر انجام دی جا رہی ہے تاکہ جس طرح فلسطین کے مسئلے کی تحلیل کر دی گئی ہے اور آج فلسطینی قیادت دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہے، یہی حشر کشمیر کی تحریک کا بھی ہو۔ افسوس کہ حریت کانفرنس کے نئے سربراہ عبدالغنی بٹ نے فلسطین کی بربادی کے اس پورے عمل سے عبرت پکڑنے کے بجائے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں اس کی خواہش کی ہے کہ آؤ اور ہمیں بھی اسی طرح ذبح کرو جس طرح اہل فلسطین کو کر رہے ہو:

> ہم اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں اور اسلام آباد اور دہلی جانا اور بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جو گروپ دہلی میں رہنماؤں سے بات کر رہا ہے، اسے اسلام آباد جانا چاہیے اور جو گروپ اسلام آبادیوں سے بات کر رہا ہے اسے دہلی جانا چاہیے، اور وہاں رہنماؤں سے بات کرنا چاہیے تاکہ بے اعتمادی کی دیواریں ایک ہی دفعہ ہمیشہ کے لیے گر جائیں۔ جو مصنوعی خطوط کھینچے گئے ہیں وہ مٹ جائیں اور ہم ایک بامقصد راستے پر آگے بڑھیں۔ آیئے، امید کریں برعظیم میں یاسر عرفات اور شمیر پیریز ظاہر ہوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالیں اور امن کے لیے کام کریں (انٹرویو، شاشی کمار، سری نگر، ۱۷ اگست ۲۰۰۰ء)۔

اگر یہ لن ترانی حالات سے ناواقفیت کی پیداوار ہے تو افسوس ناک ہے، اور اگر جانتے بوجھتے یہ راگ الاپا گیا ہے تو شرم ناک، لائق ماتم اور خطرے کی گھنٹی ہے!

---

اوپر ہم نے جس منصوبے اور پروگرام کا خلاصہ پیش کیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مختلف اجزا کے بارے میں چند تائیدی شہادتیں پیش کر دی جائیں تاکہ امریکہ اور بھارت کی سیاست کا اصل چہرہ سامنے آجائے۔

لندن کا روزنامہ فنانشل ٹائمز اپنے ادارتی نوٹ میں لکھتا ہے:

مارچ میں صدر کلنٹن کے اس علاقے کے دورے کے بعد مستقبل کے لیے ایک نقشہ (road map) ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے جو بقاے باہمی کی طرف جاتا ہے۔ اس کے مطابق ابتدائی طور پر جنگی کارروائیوں میں کمی کی جائے گی۔ بعد کے مراحل میں یہ شامل ہے کہ بھارت کی متنازع ریاست جموں و کشمیر میں اختیارات کی منتقلی کی کسی شکل کی ابتدا کی جائے۔ بھارت اور پاکستان دونوں کی طرف سے اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ نام نہاد کنٹرول لائن جو کشمیر کے ان کے متعلقہ حصوں کو تقسیم کرتی ہے دراصل ایک سرحد ہے، اور افواج کی تعداد میں وہ کمی کی جائے جو جوہری استعداد میں اضافے کے اندیشے کو کم کرے۔ اس عمل کی کامیابی کے زیادہ امکانات ہوں گے اگر اس کو کسی قطعی تصفیے کے تصور کو پیش نظر رکھے بغیر مرحلہ بہ مرحلہ آہستہ چلایا جائے۔ بھارتی سیاست میں اختیارات کی زیادہ منتقلی کا رجحان اس میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے، اس لیے کہ یہ کشمیریوں کے لیے کسی قسم کی خودمختاری کے تصور کو کم اجنبی بنا دے گا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان قریبی اقتصادی تعلقات بھی کسی آخری سمجھوتے کے لیے فضا کو خوش گوار بنائیں گے (اداریہ: Kashmir's Hope، ۳ اگست ۲۰۰۰ء)۔

لندن کا دوسرا اہم روزنامہ دی گارجین یہی بات یوں بیان کرتا ہے:

امریکہ کی جانب سے خاموشی سے ترغیب دلانے پر بھارتی حکومت نے حال ہی میں ریاست کشمیر کی علیحدگی پسند مخالف پارٹیوں پر مشتمل حریت کانفرنس سے رابطہ کیا۔ حکومت نے کچھ قیدیوں کو رہا بھی کر دیا۔ جواباً کشمیر کے وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ پریشان ہوئے کہ انھیں نظرانداز کیا جا رہا ہے، چنانچہ انھوں نے خودمختاری کی نئی تجاویز پیش کیں جو کشمیر میں ۱۹۵۳ء سے قبل کے نظام کے نمونے پر تھیں۔ اس منصوبے سے ابتدائی طور پر دہلی میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ہندو حکومت کے جارحیت پسند ممبران کی طرف سے کافی شور مچایا گیا لیکن اس کو فوراً ہی رد نہیں کر دیا گیا۔ پھر گذشتہ ماہ پاکستان سے وابستہ نمایاں اسلامی گروپ حزب المجاہدین نے جنگ بندی کا اعلان کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جنرل مشرف پر امریکہ کے محتاط دباؤ نے اس میں کردار ادا کیا ہے (اداریہ: Kashmir's Killing Fields، ۳ اگست ۲۰۰۰ء)

اس اداریے میں پاکستان کی قیادت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بین السطور بہت واضح ہے اور بہ آسانی اسے پڑھا جا سکتا ہے:

پاکستان کے فوجی رہنما جنرل پرویز مشرف جس حد تک پاکستان سے کارروائی کرنے والے جنگجو، مقامی اور غیرملکی اسلامی گروپوں کو کنٹرول کر سکتے ہیں یا اس کے لیے رضامند ہیں، اس کا نہ صرف

کشمیر کے مستقبل پر بلکہ خود ان کے مستقبل پر فیصلہ کن اثر ہوگا۔ زیادہ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو کشمیر، امریکہ کی پشت پناہی اور امریکی اسلحے سے لیس بھارت کو پاکستان کے خلاف کھڑا کرتا ہے جو فوجی انقلاب کے بعد کی تنہائی میں حمایت کے لیے روس اور چین کی طرف دیکھتا ہے۔ کشمیر کی بڑی اہمیت ہے۔

لندن کا روزنامہ دی ٹائمز لکھتا ہے:

امریکیوں کی تعریف کرنا چاہیے کہ وہ اپنے قابل لحاظ اثرات کو مؤثر طور پر اور دھیمے انداز سے استعمال کر رہے ہیں۔ اب یہ اسلام آباد اور دہلی کا کام ہے کہ وہ یقینی بنائیں کہ اگر یہ پہلا قدم بھی ضائع ہو جاتا ہے تو امن کا راستہ ایک سراب رہے گا (اداریہ: Ceasefire in Kashmir، ۸ اگست ۲۰۰۰ء)۔

بھارت کے دی ہندو گروپ کے اہم پندرہ روزہ رسالے فرنٹ لائن نے ایک مفصل مضمون: Kashmir Conundrum (کشمیر کا معما) شائع کیا ہے جس میں بھارت، پاکستان، امریکہ اور خود مختاری کے مسئلے پر کلام کیا گیا ہے۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

یہ حقیقت ہے کہ بی جے پی کی حکومت کی کشمیر پر، سوائے جنگجوئی کے، کوئی واضح پالیسی نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے سرکاری پالیسی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کوئی مکالمہ اور کوئی حل پیش کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلا کو ایڈہاک خبروں سے یا ان پالیسی تناظرات سے بھر دیا گیا ہے جو امریکی انگیجمنٹ پر بنائے ہوئے منصوبوں اور داخلی ضرورت پوری کرنے کے لیے فرقہ واریت کے منصوبوں پر مبنی ہیں (۱۴ اگست ۲۰۰۰، ص ۱۱۱)۔

یہی مضمون نگار بھارت اور امریکہ کے گٹھ جوڑ کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

مغربی اسٹرے ٹیجک اور عسکری منصوبوں کے ساتھ بھارت کا گٹھ جوڑ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے جیساکہ امریکہ اور فرانس کے ساتھ اس کی جامع مشترکہ فوجی مشقوں سے یا اسرائیل کے ساتھ اس کے تازہ مضبوط تر تعلقات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جسونت سنگھ اور ایڈوانی کے حالیہ دورے صرف تعلقات کو معمول پہ لانے سے بڑھ کر علاقائی اسٹرے ٹیجک تعاون، اعلیٰ ٹکنالوجی کی منتقلی اور فوجی اور خفیہ دائروں میں براہ راست تعاون سے متعلق تھے۔ اس کا مقابلہ اس سے کریں کہ جب اسرائیل نے چین کو ٹکنالوجی فروخت کی تو امریکہ کا ردعمل کیا تھا۔ امریکہ نے اسرائیل کو مجبور کیا کہ وہ اس معاہدے کو جس پر مشترکہ دستخط ہوئے تھے، یک طرفہ طور پر ختم کردے۔

اس طرح سیاسی و نظریاتی دائروں میں بی جے پی کا بھارت، امریکہ کے بہت زیادہ قریبی حلیف کی حیثیت سے تیزی سے ابھر رہا ہے۔ ایف بی آئی، جو سرکاری طور پر امریکہ کے اندر ہی خفیہ

معلومات جمع کرنے کا کام کرتی ہے، نئی دہلی میں اپنا دفتر کھولنے والی ہے (فرنٹ لائن، ص ۱۱۰)۔

فرنٹ لائن میں اس کے نمایندہ سری نگر پراوین سوامی کی رپورٹ کا یہ حصہ بھی قابل غور ہے:

> امریکہ، خصوصاً اس کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کا جنگ بندی کا اہتمام کروانے میں جو کردار ہے، وہ خطرے کی گھنٹی ہے (۸ اگست ۲۰۰۰ء)۔

اس نمایندے کی نگاہ میں وادی کی خود مختاری یہہ اور جموں کی الگ صف بندی بھی امریکہ ہی کے ایما پر ہو رہی ہے۔ جموں اور کشمیر کو تین خود مختار علاقوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پر تیزی سے غور کیا جا رہا ہے۔ لداخ کے علاقے میں کارگل کو یہہ سے الگ کیا جا رہا ہے اور لداخ کو یہہ ترقیاتی کونسل کے تحت لایا جا رہا ہے۔ جموں کو ڈوگرہ اکثریت کی ریاست میں تبدیل کیا جا رہا ہے جس سے وہاں کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی ہے۔ ریاست کی یہ سہ گونہ تقسیم (trification) بھی امریکی منصوبے کا حصہ ہے۔ جیساکہ بھارت کے مشہور علمی مجلہ Economic and Political Weekly میں ریکھا چودھری Autonomy Demand: Kashmir at Crossroads لکھتی ہیں:

> ایسی ہی ایک تجویز کشمیر اسٹڈی گروپ کی طرف سے سامنے آئی ہے جس کے سربراہ امریکہ میں رہنے والے کشمیری ارب پتی فاروق کاٹھواری ہیں۔ حال ہی میں اس نے ایک رپورٹ شائع کی ہے: Kashmir: A Way Forward (کشمیر، آگے کا ایک راستہ) جس میں ڈکسن پلان کی بنیاد پر ریاست کی تنظیم نو اور مذہبی بنیادوں پر اس کی تقسیم کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ جموں کی علیحدہ ریاست کا مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے اٹھایا جاتا ہے جو ڈوگرہ / ہندوؤں کی نمایندگی کا دعویٰ کرتے ہیں (۲۲ جولائی ۲۰۰۰ء)۔

امریکہ کی کھلی اور چھپی سفارت کاری میں ایک طرف کشمیر کا یہ "حل" مرکزی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف بھارت کی معاشی اور عسکری قوت کی ترقی، اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا مستقل ممبر اور بالآخر ایک ایٹمی طاقت تسلیم کرنا اور پاکستان پر یہ دباؤ ڈالنا شامل ہے کہ بھارت کو علاقے کی بالادست قوت تسلیم کرے، اپنی فوجی طاقت کو کم کرے، کشمیر پر خاموشی اختیار کرے، سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرے، نیوکلیر صلاحیت کو ختم کرے یا محدود کرے اور ساری توجہ معاشی بحالی اور تجدید آبادی پر صرف کرے۔

سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی قوم کو یہ پوزیشن قبول ہے؟ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ پاکستان کسی قیمت پر بھی اس حیثیت کو قبول کرنے کو تیار نہیں بلکہ ہم یہ بھی کہیں گے جو اس رول کو اختیار کرے گا، یہ قوم اسے ان شاء اللہ برداشت نہیں کرے گی، خواہ وہ کوئی بھی ہو!

ہمارے اس واضح اور دو ٹوک اظہار برأت کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانان پاک و ہند نے آزادی کی ساری جدوجہد جس مقصد کے لیے کی تھی وہ ایک ایسے پاکستان کا قیام اور استحکام تھا جو مسلمانوں کی آزادی ہی

نہیں، ان کے دین اور تہذیب و تمدن کا صحیح نمونہ ہو اور جس کے ذریعے مسلمان عالمی برادری میں اپنا حقیقی مقام حاصل کر سکیں۔ یہ جدوجہد بھارت کی بالادستی سے نجات کے لیے تھی، ایک نئی صورت میں اس کے دام میں گرفتار ہونے کے لیے نہیں۔ پھر کشمیر کا مسئلہ نہ دو ریاستوں کے درمیان کوئی سرحدی تنازعہ ہے اور نہ محض پانی کے منبع پر قبضے کا ذریعہ۔ یہ تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا اور ڈیڑھ کروڑ انسانوں کی آزادی اور نظریاتی تشخص کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ بات حق اور اصول کی اور اہل جموں و کشمیر کے حق خود ارادیت کی ہے جس سے بھارت نے ان کو آج تک محروم رکھا ہے۔ آج کلنٹن صاحب بھی کہہ رہے ہیں اور واجپائی صاحب بھی گویا ہیں کہ اب دنیا میں سیاسی نقشے تلوار سے نہیں بدلے جا سکتے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری بیسویں صدی طاقت کے ذریعے نقشوں کی تبدیلی کی صدی ہے۔

خود بھارت نے کشمیر، جوناگڑھ، حیدر آباد اور گوا پر قبضہ صرف طاقت کے ذریعے ہی کیا ہے۔ نیپال اور بھوٹان آزاد ملک ہیں مگر بھارت نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر انھیں اپنی سیاسی اور معاشی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دولخت کرنے کا کام بھی صرف طاقت ہی کے ذریعے انجام دیا گیا ہے۔ سری لنکا میں تامل تحریک بھی بھارت ہی کی پشت پناہی میں شروع ہوئی۔ افغانستان، مشرقی یورپ، وسط ایشیا اور حال ہی میں یوگوسلاویہ اور انڈونیشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، وہاں مسئلہ آج طاقت سے سیاسی نقشے کو تبدیل کرنے کا نہیں ہے، بلکہ جس طاقت نے بزور شمشیر کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے، عوامی رائے کی قوت سے مسئلہ اس قابض سے نجات پانے کا ہے۔ طاقت کا استعمال تو قابض بھارت کر رہا ہے جس نے ۷ لاکھ فوج وہاں مسلط کر رکھی ہے اور صرف طاقت کے بل بوتے پر وہاں کے عوام کو ان کی مرضی کے خلاف اپنی غلامی میں رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کا اعتراف اب خود بھارت کے وہ دانش ور کر رہے ہیں جو ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر زبان کھول رہے ہیں۔ اس سلسلے میں Economic Political Weekly کے ۲۹ جولائی ۲۰۰۰ء کے شمارے میں ایک ہندو دانش ور گوتم نولکھا (Gautam Navlakha) کا مضمون بہت چشم کشا اور پاکستان کی قیادت اور ان دانش وروں اور کالم نگاروں کے مطالعہ کے لائق ہے جو کشمیر کو بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی باتیں دبے لفظوں میں کر رہے ہیں۔ مضمون کا عنوان ہے: Kashmir: It's Never too Late to Do the Right Thing مقالہ نگار شروع میں لکھتا ہے:

> حکومت بھارت کی، پاکستان کی فوجی قیادت کے ساتھ، غیر مشروط مذاکرات کی پیش کش کو خوش آمدید نہ کہنا ناسمجھی کی بات ہوگی۔ لیکن حکومت کے خلوص کو اس کے ظاہر (face value) پر قیاس کرنا فاش غلطی ہوگی۔ پیش کش کے اعلان سے صرف ۲۴ گھنٹے پہلے وزیراعظم نے پُرزور طریقے سے کہا تھا کہ گفت و شنید بھارت کے دستور کے دائرے میں ہوگی لیکن اگر اسے اپنی بات

سے پھر جانے (back tracking)' اور معاہدات کی خلاف ورزی کی تاریخ' اور اس حقیقت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے کہ یہ رجحان امریکہ کی جانب حالات سازگار بنانے کا نتیجہ ہے تو پھر شبہات کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن شاید اس کی سب سے بڑی وجہ اپنی سرحدوں کے تحفظ کا خبط ہے۔

مقالہ نگار اس امر کا بار بار اعتراف کرتے ہیں کہ کشمیر پر فوج کا قبضہ ہے اور محض طاقت کی حکمرانی ہے اور حکومت پاکستان کی طرف سے کوئی کمزوری نہ دکھائی جائے اور اس فیصلہ کن مرحلے میں ایمان اور ہمت کے ساتھ جدوجہد کو جاری رکھا جائے تو بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں کے فریم ورک میں سہ فریقی مذاکرات اور عوام کی مرضی کے مطابق مسئلے کے حل کے لیے مجبور ہوگا۔ یہی مقالہ نگار عسکری صورت حال کا جائزہ لے کر برملا اظہار کرتا ہے کہ بھارت کے لیے یہ جنگ روز بروز مہنگی ہو رہی ہے اور توازن اس کے خلاف جا رہا ہے۔

کشمیر کے عوام کے ساتھ بھارت کے [نام نہاد] "اچھے" لوگوں کی جانب سے گذشتہ ۱۱ سال سے انتہائی توہین' تذلیل اور تحقیر کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ نہایت بے رحمی سے غیروں جیسا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ آج کشمیر میں لفظ "آزادی" وہاں کے عوام کے ان تجربات کا دوسرا نام ہے۔ علیحدگی کا یہ عمل ریاست پر غیر معمولی انحصار' ترقی کے محدود امکانات' سرمایہ کاری کے فقدان' بے روزگاری اور کھلے عام کرپشن کے پیدا کیے ہوئے احساس محرومی اور ۱۱ سال سے مسلسل کیے جانے والے تشدد کی وجہ سے واضح اور تیز رفتار تبدیلی سے گزرا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھارت سے علیحدگی ایک مقبول عام مطالبہ بن گیا۔ یہ بھارت کی تاریخ کے ایک ایسے مرحلے پر ہوا جب فرقہ وارانہ فاشزم مضبوط ہو رہا تھا۔ بابری مسجد کے لیے شوریدہ مہم اور اس کا انہدام' مسلم دشمن فسادات جن کے بعد مجرموں کو سزا بھی نہ دی جاتی تھی' ان سب نے بھارتی جمہوریت پر اعتماد کو کھوکھلا کر دیا۔

سرکاری افواج کے خلاف غم و غصہ بہت عام ہے۔ ہلاک ہونے والوں کی جو تعداد بھارتی حکومت بیان کرتی ہے اس پر ریاستی حکومت بھی یقین نہیں رکھتی۔ وزارت داخلہ ۲۰ ہزار اموات تسلیم کرتی ہے' جبکہ ریاستی حکومت گذشتہ ۱۱ سال کی لڑائی میں مرنے والوں کی تعداد ۷۰ ہزار بتاتی ہے۔ آزاد ذرائع اس سے زیادہ تعداد کی' اور اس میں سرکاری افواج کی مجرمانہ کارروائیوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ کشمیر یونی ورسٹی کے بشیراحمد دابلہ نے Save the Children Fund کے لیے تیار کردہ ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ ۱۹۹۹ء تک کشمیر میں ۶۰ ہزار افراد ہلاک ہو چکے تھے اور ۲۰ ہزار یتیم اور ۱۲ ہزار بیوائیں موجود تھیں۔ عام طور پر حکومتیں اپنی افواج کی طرف سے کی جانے والی شہری ہلاکتوں کو کم کر کے بیان کرتی ہیں اور جنگجوؤں کو ملزم گردانتی ہیں۔ اس مطالعے

میں بتایا گیا ہے کہ ۸۰ فی صد اموات کراس فائرنگ‘ سیکورٹی فورسز کے زیر حراست قتل اور منحرفین کے ہاتھوں ہوئیں۔ سری نگر کے ذہنی امراض کے سرکاری ہسپتال کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰ میں سے ۶۰ افراد سیکورٹی فورسز کے ظلم و تشدد کی وجہ سے یا اپنے کسی قریبی شخص پر تشدد ہوتے دیکھ کر ہوش و ہواس کھو بیٹھے تھے۔ ریاست کے سینئر افسران تسلیم کرتے ہیں کہ زیرحراست قتل کی وارداتوں میں پریشان کن اضافہ ہوا ہے یعنی گذشتہ تین ماہ میں ۲۱‘ جب کہ آل پارٹیز حریت کانفرنس کے مطابق اس مدت میں ۵۸ ہلاکتیں ہوئیں۔ ریاستی انتظامیہ کا مسلح افواج پر کوئی کنٹرول نہیں ہے اور اپنی پریشانی یا بے اختیاری کا وہ نجی طور پر ہی اظہار کرسکتے ہیں۔ بہرحال گذشتہ ۱۱ برسوں میں کوئی ایک کشمیری گھرانہ بھی نہیں بچا ہے جو متاثر نہ ہوا ہو اور ہر خاندان کے پاس بیان کرنے کے لیے ایک کہانی ہے۔

حالات کا یہ جائزہ تازہ ترین صورت حال پیش کرتا ہے اور ایک معروف بھارتی دانش ور کے قلم سے ہے جو زمینی حقائق پر مبنی ہے اور جس کی تائید دوسرے آزاد ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔

**ٹائمز آف انڈیا کے معروف کالم نگار سوامی ناتھن ایس اے۔ انکلیساریا آیئر لکھتے ہیں:**

مدھوکشور نے اپنے حالیہ مضمون میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ ہمارے محافظ دستوں کو کشمیری اپنا محافظ سمجھنے کی بجائے جلاد تصور کرتے ہیں۔ ان پر عورتوں کی عصمت دری‘ تشدد اور معصوم افراد کے قتل کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس الزام میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہو لیکن اگر اس میں ایک چوتھائی بھی حقیقت ہے تو یہ ہمارے اخلاقی زوال کا بدترین ثبوت ہے۔

حفاظتی دستوں کی بربریت سے ہر روز نئے نئے ”دہشت گرد“ جنم لیتے ہیں۔ سیکورٹی دستوں کے مظالم کا جو لوگ شکار ہوتے ہیں یا جو لوگ مارے جاتے ہیں ان کے رشتہ دار بالآخر عسکریت پسندی کا راستہ اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حکومت کے لیے یہ آسان بہانہ ہے کہ سارا الزام پاکستان یا اسلامی دہشت گردوں پر ڈال دیا جائے۔ حالانکہ دہشت گردی بڑھنے کی سب سے بڑی وجہ ہماری اپنی سیکورٹی افواج ہیں۔ تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے رویے میں کوئی تبدیلی اب تک واقع نہیں ہوئی ہے‘ نتیجہ یہ ہے کہ کشمیریوں کی بھارت سے دوری بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ نیت چاہے کتنی ہی صاف و پاک رہی ہو‘ لیکن جو کچھ ہو رہا ہے‘ وہ ملک کی تعمیر کے لیے نہیں ہو رہا ہے۔

کشمیری کیا چاہتے ہیں کیا نہیں چاہتے‘ اس کا فیصلہ کرنے کا حق نہ تو ہم صحافیوں کو ہے اور نہ سیاست دانوں کو‘ بلکہ اس کا فیصلہ خود کشمیریوں کو کرنا چاہیے۔ رائے شماری سے اصل حقیقت سامنے آجائے گی۔ کشمیر کے عوام سے یہ دریافت کیا جانا چاہیے کہ وہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا بھارت کے ساتھ؟ بھارت اور پاکستان دونوں کو اپنا مقدمہ کشمیری عوام کی عدالت میں پیش

کرنا چاہیے۔

کشمیر میں ہلاکتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ میرے ضمیر کو بھی ملامت کر رہا ہے۔ میرے خیال سے ۳۰ ہزار بہت بڑی تعداد ہے۔ ہم نے لبرل اقدار پر ملک کی تعمیر میں ۵۰ سال کا وقت صرف کیا ہے۔ تو آیئے ان اقدار سے اپنی عقیدت برقرار رکھیں' بجائے اس کے کہ الحاق کی دستاویز جیسی قانونی موشگافیوں میں ہم اپنا وقت ضائع کریں--- آیئے کشمیریوں کو رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لینے دیں (ٹائمز آف انڈیا' ۱۶ جولائی ۲۰۰۰ء)۔

---

ان حالات میں حکومت پاکستان' پاکستانی فوج اور پاکستانی قوم پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تاریخ کے اس نازک لمحے میں ذرا سی بے تدبیری سارے کیے دھرے پر پانی پھیر سکتی ہے اور ۱۲ نہیں ۵۲ سال کی قربانیوں کو تلپٹ کر سکتی ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جنگیں میدان جنگ سے بھی پہلے دل و دماغ میں جیتی یا ہاری جاتی ہیں۔ میدانی پوزیشن مجاہدین اور تحریک مزاحمت کے حق میں ہے لیکن سیاسی اور معاشی دباؤ کا مردانہ وار مقابلہ کیے بغیر' اس پوزیشن کو باقی رکھنا اور اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچانا ممکن نہیں۔ جنرل مشرف صاحب اور فوج کی قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملت پاکستان کے مبنی برحق موقف کے لیے ڈٹ جائیں اور کسی سطح پر بھی کمزوری نہ دکھائیں۔ معاشی محاذ کو بھی مضبوط کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے قوم سے لڑنے کے بجائے اس کے اشتراک سے مسائل کو حل کرنے کی سعی ہی مفید اور مؤثر ہو سکتی ہے۔ لیکن سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہم کشمیر پر اپنے اصولی موقف سے سرمو انحراف نہ کریں اور قوم کو اعتماد میں لے کر کشمیری مسلمانوں کی مخلصانہ اور مجاہدانہ پشتی بانی جاری رکھیں۔

مجاہدین نے جان کی بازی لگا دی ہے۔ اگر ان کو یقین ہو کہ پاکستان ان کے ساتھ ہے اور کوئی کمزوری نہیں دکھائے گا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ ہمت اور عزیمت سے دشمن کا مقابلہ کریں گے اور ان شاء اللہ فاتح اور سرخرو ہوں گے۔ مسئلہ وقت کا نہیں' عزم اور وژن کا ہے۔ چین نے ہانگ کانگ کے معاملے میں سو سال صبر کیا۔ مکاوو (Macao) کے علاقے کو ساڑھے چار سو سال کے بعد بالآخر حاصل کر لیا ہے۔ فارموسا کے سلسلے میں بھی چین کسی سمجھوتے یا کمزوری کے لیے تیار نہیں' بلکہ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ کشمیر کے معاملے میں تو پوری کشمیری قوم بھارت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور تمام تجزیہ نگار اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو اب بھارت کے نظام کے تحت رکھنا ممکن نہیں۔

ایسے حالات میں امریکی دباؤ کے تحت پاکستان کی ذرا سی کمزوری ان کو پاکستان سے مایوس تو کر سکتی ہے'

بھارت کی غلامی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ امریکہ کا اپنا کھیل ہے اور ہمیں اس کھیل کو، اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ بھارت کے اپنے عزائم ہیں لیکن وہ اب ان عزائم کو پورا نہیں کر سکتا۔ جو چالیں بھارت چل رہا ہے اور "خودمختاری" اور تقسیم در تقسیم کے جو منصوبے روبہ عمل لائے جا رہے ہیں، یہ مسئلے کا حل نہیں۔ کشمیر کے مسئلے کا صرف ایک حل ہے اور وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت استصواب اور حق خود ارادیت کا حصول ہے۔ پاکستان، بھارت اور کشمیری عوام اس مسئلے کے برابر کے شریک ہیں اور بھارت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سہ فریقی مذاکرات کے ذریعے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کے لیے تیار ہو۔ اس میں جتنا وقت لگے، ساری جدوجہد اسی ایک نکتے پر مرکوز رہنی چاہیے۔ سیاسی جدوجہد، سفارتی کوششیں اور جہادی سرگرمیاں، یہ سب ایک ہی تحریک کے مختلف پہلو ہیں اور ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث ہیں۔ اس کے لیے بیرونی دباؤ کا مقابلہ اور خود اپنی صفوں میں کمزوری دکھانے والوں سے گلوخلاصی ضروری ہے۔ یہی حقیقی چیلنج ہے اور اس چیلنج کا مردانہ وار اور مؤثر مقابلہ کیے بغیر کشمیر کے مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

سیاسی جدوجہد اور مذاکرات کی کامیابی کا انحصار بھی جہادی قوتوں کی مضبوطی اور فیصلہ کن کارروائیوں پر ہے۔ اس سے ہٹ کر جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا، وہ ایک کامیاب جدوجہد کو غتربود کرنے اور ایک پوری نسل کی بیش بہا قربانی کو ضائع کرنے پر منتج ہو سکتا ہے۔ عزت اور کامیابی، نہ مذاکرات کی بھیک مانگنے میں ہے، اور نہ صلح کے لیے کسی نوعیت کی جلدبازی اور کمزوری دکھانے میں۔ اصولی موقف پر استقامت اور ہر محاذ پر جدوجہد اور پیش قدمی ہی ہمیں اصل منزل تک لے جا سکتی ہے۔ ہمارے لیے ہدایت کا سرچشمہ قرآن پاک کی یہ ہدایت ہے:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ( سورۃ محمد ۴۷: ۳۵) پس تم بودے اور کم ہمت نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو، اللہ تمھارے ساتھ ہے اور تمھارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

اور اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر ہم ایمان کے تقاضے پورے کریں تو کامیابی ہماری ہی ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ ( اٰل عمرٰن ۳:۱۳۹) اور ہمت مت ہارو اور رنج نہ کرو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم پورے پورے مومن رہو۔

---

نوٹ: خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع کو کشمیر کے مسئلے کی غیر معمولی اہمیت کے باعث مؤخر کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ آیندہ شمارے میں اس بحث کی تکمیل کی کوشش کی جائے گی۔ (مدیر)

**حکمت مودودیؒ**

# جماعت اسلامی کیوں قائم کی گئی؟

میں جو بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی جس غرض کے لیے قائم ہوئی ہے وہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کو عملاً پوری طرح سے زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اس کے سوا اس جماعت کا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس جماعت سے وابستہ ہے خواہ رکن کی حیثیت سے وابستہ ہو یا متفق کی حیثیت سے یا کارکن کی حیثیت سے' اسے اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کا اصل مقصد دین حق کو پوری طرح سے خدا کی زمین پر قائم کرنا ہے۔ سیاسی کام بھی اگر ہم کرتے ہیں تو سیاسی اغراض کے لیے نہیں کرتے اور نہ محض اقتدار حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں بلکہ اس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو دین حق کے قیام میں مانع ہو رہی ہیں اور جمہوری ذرائع سے ملک کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کا راستہ ہموار کیا جائے۔

جماعت اسلامی کو کیوں اصرار ہے کہ وہ جمہوری ذرائع سے ہی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے اور غیر جمہوری ذرائع کے استعمال کی مخالف ہے؟ اس کو چند الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ جماعت نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی قسم کے تشدد کے ذریعے سے' یا کسی قسم کی دہشت پسندانہ تحریک کے ذریعے سے' یا کسی قسم کی خفیہ تحریک کے ذریعے سے' یا کسی قسم کی سازشوں کے ذریعے سے انقلاب برپا نہیں کرنا چاہتی بلکہ جمہوری ذرائع سے ہی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے۔ یہ قطعاً اس لیے نہیں ہے کہ ہم اپنی صفائی پیش کر سکیں کہ ہم دہشت پسند نہیں ہیں' اور ہمارے اوپر یہ الزام نہ لگنے پائے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلامی انقلاب اس وقت تک مضبوط جڑوں سے قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ لوگوں کے خیالات نہ تبدیل کر دیے جائیں' جب تک لوگوں کے اخلاق' لوگوں کی عادات کو تبدیل نہ کر دیا جائے۔ اگر کسی قسم کے تشدد کے ساتھ' یا کسی قسم کی سازشوں کے ساتھ' یا کسی قسم کی دھوکے بازیوں کے ساتھ اور جھوٹ اور اسی طرح کی مہم کے ساتھ انتخابات جیت بھی لیے جائیں یا کسی طریقے سے انقلاب برپا کر بھی دیا جائے تو چاہے یہ انقلاب کتنی دیر تک رہے' یہ اسی طرح اکھڑتا ہے جیسے اس کی کوئی جڑ ہی نہ ہو۔ آپ نے ایوب صاحب کا دور دیکھا کہ کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کو کوئی ہٹا سکے گا لیکن جب وہ ہٹا تو

یہ معلوم ہوا کہ اس کی کوئی جڑ ہی نہیں تھی۔ آج اس کا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اس طرح سے جن لوگوں نے ناجائز ذرائع سے انتخابات جیت کر بظاہر جمہوری طریقے سے اقتدار حاصل کیا ہے ان کی بھی حقیقت میں کوئی جڑ نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی دو آدمی ایسے نہیں ہیں جو ایک دوسرے کے مخلص ہوں۔ ان کو اغراض نے ایک دوسرے کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اغراض ہی ان کو ایک دوسرے سے پھاڑتی ہیں۔ اغراض ہی نے ان کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔

اب دوسرا کام جو آپ کے سامنے ہے اور بہت بڑا کام ہے وہ یہ ہے کہ عام لوگوں کے خیالات کو تبدیل کیا جائے۔ عام لوگوں کے اندر اسلامی فکر اور اسلامی نظام کے بنیادی تصورات کو بٹھایا جائے' اور لوگوں کے اندر اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ پچھلے ۲۶' ۲۷ سال میں جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کے اختیارات رہے ہیں' خواہ وہ سیاسی اختیارات ہوں' خواہ وہ معاشی اختیارات ہوں' خواہ وہ تعلیمی اختیارات ہوں' جن لوگوں کے ہاتھ میں بھی ملک کو چلانے کے اختیارات رہے ہیں' انھوں نے قوم کے ذہن کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے' اور اس کو اسلام سے دُور سے دُور تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار مشرقی پاکستان پاکستان سے الگ ہو گیا۔ وہاں یہ ذہن پیدا کیا گیا کہ بنگالی بولنے والا ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور جو بنگالی نہیں بولتا وہ دوسری قوم ہے۔ اور اب یہاں اس کفر کو پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہاں ملک کے اندر یہ ذہن پیدا کیا جا رہا ہے' اور زبردستی پیدا کیا جا رہا ہے کہ یہ پٹھان ہے' یہ بلوچی ہے' یہ سندھی ہے اور یہ پنجابی ہے۔ کیا یہ پاکستان کی بنیاد تھی؟ سارے ہندستان کے مسلمان یہ بھول گئے تھے کہ وہ مسلمان ہونے کے سوا بھی کچھ ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انھوں نے کوشش کی اور متحدہ مطالبہ کیا تب پاکستان وجود میں آیا۔ اگر گجراتی' مدراسی' سندھی' پٹھان اور پنجابی الگ الگ قوم رہتے اور الگ الگ اپنی قومیتوں کا تصور رکھتے تو پاکستان کبھی نہیں بن سکتا تھا۔

اب یہ تصور باقی ماندہ پاکستان کے بھی ٹکڑے کر دینے والا ہے۔ سندھ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تصور پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے' درآں حالیکہ سندھی مسلمان اور غیرسندھی مسلمان سندھ کا نہایت مخلص اور سیدھا سادا مسلمان ہے۔ وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے میں یہ زہر خاص طور پر پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ سندھی بولنے والا ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور جو سندھی نہیں بولتا وہ دوسری قوم ہے۔ ایک طرف تو لوگوں کے نظریات بگاڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دوسری طرف اخلاق کو بگاڑنے کے لیے تمام ممکن ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔ تیسری طرف تعلیم کا ایسا نظام رائج کیا جا رہا ہے کہ آدمی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کے مسلمانوں کو کیا بنانا مقصود ہے اور انھیں کس طرف لے جانا ہے۔

اس حالت میں آپ کو جان مار کر کوشش کرنی ہے اور اپنی پوری قوت صرف کرنی ہے کہ عام لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ اسلامی ذہن پیدا کیا جائے۔ جب تک آپ یہ کام نہیں کریں گے اس وقت تک یہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

اس موقع پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں جمہوریت کو کبھی چلنے نہیں دیا گیا اور جمہوری طریقے سے جب کبھی انتخابات ہوتے ہیں وہ انتہائی بے ایمانی اور تشدد اور انتہائی بددیانتی کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ ان انتخابات کے ذریعے سے اگر آپ ۱۰۰ فی صد بھی ووٹ حاصل کریں تو صندوقچے سے ۱۰۰ فی صد ووٹ آپ کے خلاف برآمد ہوں گے۔ ہمیں اس صورت حال کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ اس کے لیے پوری جدوجہد کرنی ہو گی کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ کام لیا جا رہا ہے، ان کے ذہن کو تبدیل کیا جائے۔ ہمیں یہ کوشش کرنی ہے کہ انتخابات کے مراکز پر اگر کچھ لوگ بے ایمانیاں کرنا چاہیں بھی تو نہ کر سکیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب یہ خیالات ملک کے اندر پوری طرح سے مضبوطی سے جم جاتے ہیں اور قوم کے اندر پورا ارادہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی طاقت انقلاب آنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ ہر راستے سے آتا ہے۔ ایسے راستے سے آتا ہے کہ جس کے بند کرنے کا خیال کوئی سوچ تک نہیں سکتا۔

آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ انقلاب کس راستے سے آئے گا۔ آپ صرف کام کریں۔ اپنی سیرت کو درست کریں۔ جب آپ اسلام کی طرف دعوت دینے اٹھیں گے تو لوگ یہ دیکھیں گے کہ یہ دعوت دینے والے کیسے لوگ ہیں۔ اگر آپ کے اپنے اخلاق میں یا آپ کے کردار میں کوئی خرابی ہو یا آپ کے اندر ایسے لوگ پائے جائیں جو جاسوسی کرتے ہیں اور ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے والے ہوں تو پھر آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ کو اپنے اخلاق بلند کرنے پڑیں گے۔ اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنانا پڑے گا۔ اپنے اندر نظم و نسق اور نظم کی اطاعت کی عادت ڈالنی پڑے گی، اور پوری طرح سے جماعت کے دستور کی پابندی کرنی ہو گی، اور اس کے ساتھ عوام الناس کے اندر پھیل کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا ہوگا۔ اس کے لیے ۵۰ سال لگ جائیں، چاہے ۱۰۰ سال لگ جائیں، آپ کو یہ کام کرنا ہوگا۔ آپ یہ کام کریں گے تو کوئی طاقت اس ملک کو اسلامی ملک بننے سے نہیں روک سکتی (کل پاکستان اجتماع ارکان، ۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء، منصورہ سے آخری خطاب)۔

(مولانا مودودی کے دور امارت کی چند جھلکیاں، عاصم نعمانی، ص ۴۲-۴۵)

---

چٹان کے اندر ایک دانہ
تمھارے لیے مخفی ہو سکتا ہے'
مگر اس کے لیے عیاں ہے۔

آسمانوں میں کوئی ذرہ
تم سے بعید ترین ہو سکتا ہے'
مگر اللہ کے لیے وہ بہت قریب ہے۔

زمین کی تہوں میں پڑی ہوئی کوئی چیز
تمھارے لیے سخت تاریکی میں ہے'
مگر اس کے لیے بالکل روشنی میں ہے۔

لہٰذا تم کہیں کسی حال میں بھی
نیکی یا بدی کا کوئی کام ایسا نہیں کر سکتے
جو اللہ سے مخفی رہ جائے۔

جب محاسبہ کا وقت آئے گا'
تو وہ تمھاری ایک ایک حرکت کا ریکارڈ سامنے لا کر رکھ دے گا۔

(تفہیم القرآن' جلد ۴' صفحہ ۱۷)

(خیر خواہ)

# کلام نبوی ؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت یحییٰ بن طلحہ بن عبیداللہؓ روایت کرتے ہیں:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنا دیے گئے' اس کے بعد ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت طلحہؓ کو غمگین پایا۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ کیا آپ کے چچازاد بھائی ابوبکرؓ کی خلافت نے آپ کو پریشان کر دیا ہے؟ بولے: نہیں۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کرتے ہوئے کہا: میں آپ تمام لوگوں سے اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہوں۔ میری پریشانی کا سبب یہ ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ "میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ جو شخص اسے موت کے وقت کہے' اللہ تعالیٰ اس کی ہر تکلیف کو دور کر دے گا اور اس کا جسم اور روح اس کلمے کی وجہ سے راحت پائیں گے۔ لیکن افسوس کہ میں سوال پر قادر ہونے کے سبب سستی کرتا رہا اور پوچھ نہ سکا کہ وہ کلمہ کون سا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے' اور مجھے وہ کلمہ معلوم نہ ہو سکا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: پریشانی کی کوئی بات نہیں وہ کلمہ مجھے معلوم ہے۔ حضرت طلحہؓ نے کہا: تب اللہ کا شکر ہے۔ بتلایئے وہ کون سا کلمہ ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا: کیا اس کلمہ سے' جو آپؐ نے اپنے چچا کے سامنے موت کے وقت پیش کیا تھا' بڑا کوئی کلمہ ہے؟ اگر اس سے بڑا کلمہ کوئی ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے چچا کے سامنے پیش کرتے۔ حضرت طلحہؓ نے کہا: واللہ! یہ وہی کلمہ ہے یعنی لا الٰہ الا اللہ (جامع الاصول' کتاب الفضائل)۔

حضرت طلحہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے محرومی کا اتنا بڑا غم ہے کہ اداس بیٹھے ہیں' کسی سے بات چیت میل ملاپ نہیں کرتے حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کو خدشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید یہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے ناخوش ہیں۔ لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے محرومی کا دکھ ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کلمہ ایمان بھی ہے اور کلمہ راحت بھی۔ جسمانی تکلیفوں سے بھی راحت ہے اور روحانی بیماریوں سے

بھی شفا ہے۔ تمام اذکار کی اساس اور تمام دعاؤں کے لیے جامع ہے۔ خصوصاً موت کی تکالیف اور سختیوں سے راحت دینے والا ہے۔

O

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں:
ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! موذن ہم سے زیادہ کمائی کرتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا تم بھی اسی طرح کہا کرو جس طرح موذن کہتے ہیں۔ جب اذان پوری کر لو تو پھر سوال کرو' پورا کر دیا جائے گا (ابوداود)۔

موذن داعی الی اللہ ہے۔ ہر وہ شخص جو اس کی آواز میں اپنی آواز ملا دے وہ بھی موذن شمار ہوگا اور اسے بھی داعی حق کا اجر ملے گا۔ یہ وہ کام ہیں جن کے کرنے میں غفلت کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں' نہ وقت کی قلت' نہ تلفظ کی مشکل۔ کام بہت آسان اور اجر بہت بڑا۔ اذان کے وقت ذکر' اذکار' تلاوت کرنا چاہیے اور باقی باتیں موقوف کر دینی چاہییں۔ اذان کا جواب دینے میں مشغول ہونا چاہیے تاکہ موذن کے اجر میں بھی حصہ ملے۔

O

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ سے روایت ہے:
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات گزارتا تھا۔ آپؐ کے لیے وضو کا پانی اور ضرورت کی چیزیں لاتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: مجھ سے جو سوال کرنا چاہو کر لو۔ میں نے عرض کیا: جنت میں آپؐ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا: کوئی اور چیز؟ میں نے عرض کیا: نہیں بس یہی چیز! آپ نے فرمایا: میری اعانت کرو' زیادہ سجدوں کے ساتھ (مسلم' ابوداود)۔

خادم مخدوم سے اپنی خدمت کا صلہ ضرور پاتا ہے۔ پھر مخدوم سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں جن کی شان ہی اجود الناس ہے' جنھوں نے کبھی کسی سائل کے جواب میں "نہ" نہیں کہا' ایسے مخدوم سے کیا صلہ ملے گا۔ اس کی عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے! حضرت ربیعہؓ کیا صلہ چاہتے ہیں؟ کوئی اور چیز نہیں' صرف آپؐ کی رفاقت اور بس' کہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: "میری اعانت کرو زیادہ سجدوں کے ساتھ"۔
سجدوں کی کثرت کا خاصہ قرب الٰہی' انبیا' صدیقین' شہدا اور صالحین کی رفاقت ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اعانت کرو سجدوں کی کثرت سے"۔

O

حضرت ام حبیبہؓ فرماتی ہیں:
میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: جو عبد مسلم ہر دن اللہ تعالیٰ کے لیے ۱۲ رکعت نماز پڑھے (فرضوں کے علاوہ) اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک عظیم گھر بنا دیں گے۔ حضرت ام حبیبہؓ

کہتی ہیں کہ میں نے جب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ سنا ہے اس وقت سے یہ رکعتیں نہیں چھوڑیں۔ حضرت عنبتہؓ کہتے ہیں کہ جب سے میں نے حضرت ام حبیبہؓ سے سنا ہے اس وقت سے انھیں نہیں چھوڑا۔ اور حضرت عمرو بن اوسؓ نے کہا کہ میں نے جب سے حضرت عنبتہؓ سے سنا ہے اس وقت سے انھیں نہیں چھوڑا۔ ۱۲ رکعتوں سے مراد ۱۲ رکعات سنت ہیں یعنی ۲ فجر' ۶ ظہر (۴ پہلے' ۲ بعد میں) ۲ مغرب' ۲ عشا۔

سمعنا واطعنا کا کیسا عجیب منظر سامنے آتا ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک جس نے بھی سنا اس نے بات پر عمل کیا۔ سنتوں کی پابندی کرنی چاہیے۔ بہت سے لوگ نفل سمجھ کر سنتوں کی ادایگی میں غفلت برتتے ہیں بلکہ بعض تارک ہو جاتے ہیں۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ڈھالیں پکڑ لو! صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا دشمن آگیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ آگ سے بچانے والی ڈھالیں پکڑ لو۔ کہو' سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔ قیامت کے روز یہ تمھارے آگے' تمھارے پیچھے ہوں گی' تمھاری حفاظت کریں گی۔ یہ باقی رہنے والی نیکیاں ہیں (**والباقیات الصالحات**)۔

انسان جتنی بھی نیکیاں کرے' آخرت میں وہ اس کے کام آئیں گی لیکن تمام نیکیوں کی اساس وہ کلمات ہیں جو تسبیح' تحمید' توحید اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی پر مشتمل ہیں۔ اساس جس قدر مضبوط ہوتی ہے اسی قدر اس پر استوار ہونے والی عمارت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ اس لیے ان کلمات کو دوزخ سے ڈھال قرار دیا ہے۔ ان کلمات کا شعور سے ادا کرنے کا اثر یہ ہوگا کہ انسان اللہ کی نافرمانی سے بچ جائے گا اور طاعت و بندگی کی راہ پر گامزن ہوگا۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میرے رشتے دار ہیں' میں ان سے تعلق قائم کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں ان سے احسان سے پیش آتا ہوں اور وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بردباری سے کام لیتا ہوں اور وہ مجھ سے لڑتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر بات اسی طرح ہے جس طرح تو نے بیان کی ہے تو یوں سمجھو کہ تم ان کے منہ میں راکھ ڈال رہے ہو اور جب تک تم اس حالت پر قائم رہو گے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھارے لیے ان کے مقابلے میں ایک مددگار بھی ہوگا (**مسلم شریف**)۔

اللہ تعالیٰ نے قرابتوں کا جو نظام قائم فرمایا ہے اس میں انسان کے لیے سکون و اطمینان کا سامان ہے۔ قرابت

داروں سے حسن سلوک اور ان کی خدمت کا جذبہ فطرتی ہے۔ اس کو پروان چڑھانے کے لیے استقامت کا ثبوت دینا چاہیے۔ نیکی کرنے والے کا نقصان نہیں' نقصان اس کا ہے جو برائی سے پیش آتا ہے۔ اخلاص کا تقاضا یہی ہے جو حدیث پاک میں بیان کیا گیا اور اللہ تعالیٰ مخلصین کا مددگار ہوتا ہے۔

○

حضرت امیہ بن مخشیؓ کہتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور ایک شخص کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے بسم اللہ نہ پڑھی تھی۔ جب کھانے کا ایک لقمہ رہ گیا تو اسے منہ میں ڈالنے سے پہلے کہا: بسم اللّٰہ اولہ وآخرہ! "میں اللہ کے نام سے کھاتا ہوں شروع سے لے کر آخر تک"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو ہنس پڑے۔ پھر فرمایا: شیطان اس کے ساتھ کھاتا رہا جب اس نے آخر میں اللہ کا نام لے لیا تو اس نے سارا کھانا قے کر دیا (ابوداؤد)۔

بسم اللہ پڑھنے سے ہر کام میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ کھانے کے شروع میں اگر بسم اللہ بھول جائے تو درمیان اور آخر میں' جب بھی یاد آجائے بسم اللّٰہ اولہ وآخرہ پڑھ لینا چاہیے۔ جس طرح مومن کے لیے بسم اللہ پڑھ کر کھانا غذا کو مبارک' خوش گوار اور زود ہضم بنا دیتا ہے۔ بسم اللہ شیطان کے حق میں زہر قاتل ہے۔ جس کھانے پر بسم اللہ پڑھی جائے اس میں سے اسے حصہ نہیں ملتا اور اگر بسم اللہ نہ پڑھنے کی وجہ سے اس نے کھانا کھا لیا ہو تو بسم اللہ پڑھے جانے کے بعد قے کر دیتا ہے۔

○

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! اولیا اللہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب دیکھے جائیں تو اللہ یاد آجائے (مجمع الزوائد' مسند بزار)۔

اللہ کا ولی وہ ہے جس کی زندگی پوری کی پوری اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ اس کی وضع قطع' چال ڈھال' نشست و برخاست سب میں دین کی جھلک دکھائی دے رہی ہو۔ وہ سارے حقوق کو ادا کرنے والا ہو اور کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی' حسد و بغض' کبر و غرور اور جنگ و جدل سے پیش آنے والا نہ ہو۔ ایسے ہی شخص کو دیکھ کر اللہ یاد آجاتا ہے کہ دوسرے بھی اس کو اپنے لیے رہبر و رہنما بنا لیتے ہیں اور اس کے نقش قدم پر چل کر اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی حقیقی یاد محض چند الفاظ اور بیانات سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ عملی نمونوں سے پیدا ہوتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجسم قرآن تھے اور آپؐ کے صحابہؓ بھی دوسرے درجے میں مجسم قرآن تھے۔ آج کتابوں اور تفسیروں کی کمی نہیں ہے' کمی عملی نمونے کی ہے۔ جب یہ خلا پر ہو جائے گا تو اللہ کی یاد کا پورا سامان ہو جائے گا۔

# سید مودودیؒ :

## اردو ادب کے سِلسلۃُ الذَّھَب کی آخری کڑی

پروفیسر آسی ضیائی ○

اٹھارھویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے بیسیویں صدی کے ابتدائی عشرے تک اردو ادب کی خوش قسمتی سے ملک میں چند ایسی ہستیاں اٹھیں جن کی بدولت کم و بیش ہر ربع صدی میں اردو ادب کچھ انقلابی قدروں کو اپناتا ہوا اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا رہا۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ نظم یا نثر یا دونوں کو نئے انقلابی موڑ دینے والے یہ ادیب حضرات زیادہ تر ۲۰' ۲۰ سال بعد پیدا ہوتے رہے۔ یوں تو اس پورے عرصے میں کثیر تعداد میں شاعر اور نثرنگار پیدا ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں' لیکن ان سب کی حیثیت راستے پر چلنے والے مسافروں کی ہے' سڑک تیار کرنے اور قافلوں کی رہنمائی کرنے والے حسب معمول چند ہی ہیں۔ میرے شمار کے مطابق صرف سات۔ یہ ایسی سنہری زنجیر ہے جس کی ہر کڑی دوسری سے مربوط' مگر اپنی جگہ منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔ مگر اردو کی یہ بدقسمتی عرصے تک رہی کہ اپنے چند موروثی ذہنی تحفظات کے باعث ان میں سے بعض کو نقادوں نے ادب کی تاریخ میں جگہ ہی نہ دی۔ وہ سات ادیب حسب ذیل ہیں:

۱- شاہ اسماعیل شہید (پیدائش' ۱۷۷۷ء) ۲- اسد اللہ غالب (۱۷۹۷ء) ۳- سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء) ۴- مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء) ۵- مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء) ۶- علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء) ۷- سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء)۔

شاہ صاحب کا سال پیدائش بعض تاریخوں کی رو سے ۱۷۷۹ء ثابت ہوتا ہے' لیکن وہ بھی یقین سے

---

○ ریسرچ اسکالر' ادارہ معارف اسلامی' منصورہ' لاہور

یہ تاریخ متعین نہیں کرتیں۔ اس لیے ہم نے اپنی سہولت کی خاطر ۱۷۷۷ء فرض کر لی ہے تاکہ آیندہ کے ادیبوں کی پیدایش کا فرق (جو اقبال تک ۲۰، ۲۰ سال کا ہے) برقرار رہے۔ خود اقبال کی تاریخ پیدایش میں بھی اختلاف ہے تاہم، ہم نے سرکاری طور پر متعین کردہ تاریخ کو اپنے مفید مطلب پا کر اختیار کیا ہے۔ اس طرح، اس سلسلے کے سب ادیب، ماسوائے سید مودودیؒ کے ۲۰، ۲۰ سال کے فرق سے پیدا ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ یقیناً دل چسپ اور خوش گوار صورت حال ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ آج بھی نقادان کرام اس فہرست کو دیکھ کر چونکیں گے، کہ میں نے اس ادبی بدعت کی جسارت کیونکر کی، لیکن میں توقع کرتا ہوں کہ اس اجمال کی تفصیل معلوم کر کے وہ میرے نقطہ نظر سے واقف ضرور ہو جائیں گے، چاہے اس سے اتفاق نہ کریں۔

**پہلی کڑی، شاہ اسماعیل شہید:** اس فہرست کا آغاز شاہ اسماعیل شہید سے ہوتا ہے، جو اگرچہ شعر بھی کہہ لیتے تھے، لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے ان کے اشعار کی کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ظلم ان پر ضرور ہوا ہے کہ آج تک نثرنگاروں کی صف میں ان کو کوئی اہمیت نہ دی گئی، حالانکہ ان کی مختصر کتاب (رسالہ) تقویت الایمان، میرے نزدیک جدید اردو نثر کی نقیب ہے۔ یہ بات میں اپنے ایک سابق مضمون "جدید اردو نثر کا ایک فراموش کردہ سنگ میل" میں بھی ثابت کر چکا ہوں۔ یہاں مختصراً یہ کہنا ہے کہ اس کتاب سے پہلے جس طرح ہندی مسلمانوں کا ذہن دین اور دنیا کے دو الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا تھا، اسی طرح اس عہد کی تصانیف میں بھی یہ دوئی بالکل صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ یعنی ایک سلسلہ تصانیف وہ تھا جس کو ہم افادی ادب میں شمار کر سکتے ہیں اور دوسرا وہ جسے تفریحی ادب میں رکھا جا سکتا ہے۔ افادی ادب ان دنوں مذہبی ادب کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ واقعات کربلا پر مشتمل مجلس ہو یا ترجمہ و تفسیر قرآن، سب اس ایک شعبے میں آتے ہیں۔

رہا تفریحی ادب تو اس میں خواہ تحسین کی مرصع عبارت پر مشتمل نوطرز مرصع ہو یا میرامن کی ٹھیٹ "اردو زبان" میں لکھی ہوئی باغ و بہار، سب کا مقصد سوائے ذہنی عیاشی کے اور کچھ نہ تھا۔ افادی ادب کے مصنفوں کی کوشش ہوتی تھی کہ عبارت کو ہر طرح کی ادبی چاشنی سے پاک رکھ کر اسے اہل مدرسہ و خانقاہ کے پڑھنے کے لائق بنایا جائے۔ جب کہ تفریحی ادب کے خالق اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ اس میں تخیل اور انشاپردازی کو زیادہ سے زیادہ فوق الفطری رکھا جائے تاکہ صرف گنتی کے رؤسا اور ذی علم لوگ ہی اس سے تسکین حاصل کر سکیں۔ گویا مذہبی مصنفین کے لیے ذہنی لذت شجر ممنوعہ تھی اور دوسرے (تفریحی) ادیب اس بات سے مطلق بے خوف تھے کہ ان کی گمراہ کن مبالغہ آرائی اور بے راہ روی گناہ بھی بن سکتی ہے۔ یہ دونوں طبقے یہ فراموش کر چکے تھے کہ کتاب ہدایت قرآن اور ارشادات

رسولؐ (احادیث) دونوں بیک وقت اعلیٰ ادبیت اور ہدایت کے حامل ہیں، اور مسلمان ادیبوں کے لیے یہ اس معاملے میں صحیح ترین قابل تقلید نمونہ ہیں۔ اس پر مستزاد، ایک بات دونوں طبقوں میں مشترک تھی اور وہ تھی "اِخفائے ذات"۔ آپ اس عہد کی، بلکہ انیسویں صدی کے آخر تک اس مکتب فکر کی تمام تصانیف پڑھ جایئے، آپ کو مصنف کا ذاتی رجحان، اس کا اپنا نقطہ نظر، زندگی اور اس کے مسائل پر اس کا ذاتی تبصرہ بالکل معلوم نہ ہو سکے گا خواہ وہ کوئی داستان لکھ رہا ہو یا حدیث کا ترجمہ و تشریح کر رہا ہو۔ داستان کا مصنف ہر قدم پر اگلے راوی کا حوالہ دے کر اپنی ذمہ داری صرف نقل روایت تک محدود رکھے گا، چاہے اس نے اپنی طرف سے تخیل میں کتنی ہی وسیع و بلند جولانیاں دکھائی ہوں، اور دینی کتاب کا مؤلف اپنے حضرت استاذ و مرشد یا زیادہ سے زیادہ اپنے مکتب فکر (مذہب) کے فرمودات پیش کر دینے سے آگے نہ جائے گا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ کچھ تو مسلمانوں کے ذہنوں میں صدیوں کی رچی ہوئی تقلید پرستی تھی، جس نے خود کچھ سوچنے اور اختراع کرنے کی طاقت سلب کر لی تھی، اور کچھ زوال آمادہ تہذیب کا کرشمہ تھا، جس میں شرافت و متانت کی مثبت قدریں اپنانے کی ہمت نہیں رہتی، صرف منفی قدروں پر جم جانا ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ لکھنے والا اپنے مذہبی یا تہذیبی خول میں خود کو اس طرح چھپائے رکھتا ہے کہ اس کی تصنیف میں اس کی شناخت مطلق نہیں ہو سکتی۔

ان حالات میں **تقویت الایمان** وہ پہلی تصنیف ہے جس نے تحریر کی یہ تمام قلعہ بندیاں توڑ پھینکیں اور اردو ادب میں پہلی بار "اظہار ذات" کا دروازہ کھولا اور اس میں بیک وقت افادی اور ادبی قدریں سمو دیں۔ یہ پہلی کتاب ہے جس کو پڑھ کر مصنف کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس سے اتفاق یا اختلاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ غالباً اس کتاب کی حمایت یا مخالفت میں آج تک جتنا تحریری سرمایہ اردو کے حصے میں آیا ہے کسی اور کتاب کو میسر نہ ہوا۔ اور اس کو پڑھتے وقت خالص اعتقادی مسئلے پر مصنف کی تحریر کی شگفتگی، روانی اور زور کا ایسا لطف آتا ہے جیسے یہ کوئی خشک مذہبی بحث نہیں، ایک رواں دواں مقرر کی تقریر ہے جسے ہم نظروں کے راستے "سن کر" متاثر اور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ کہ شاہ صاحبؒ سے پہلے اردو کو زبان تو مل چکی تھی مگر یہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اردو کو ذہن بھی عطا کیا اور یہی ان کا انقلابی کارنامہ ہے۔

**دوسری کڑی، اسد اللہ غالب**: شاہ شہید جس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں اس کی دوسری کڑی غالب کو شمار کرنا بظاہر اجتماع ضدین سا معلوم ہوگا۔ مگر ادب کی مملکت میں تو صوفی شب زندہ دار اور رند شاہد باز سمیت سبھی برابر کی شہریت کے حامل ہیں۔ مکان کی تعمیر کرنا ہو تو مسلم اور غیر مسلم معمار کی تمیز نہیں کی جاتی۔ جو جتنا کام کرے گا اسی کے موافق اس کا مرتبہ و مقام متعین ہوگا۔ اور پھر یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ

غالب نے سچ سچ اسی رخ میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس رخ کا تعین سب سے پہلے شاہ صاحب نے کیا تھا۔ سب سے پہلے غالب کے نثری کارنامے کو دیکھیے' انھوں نے مکتوب نگاری کے زمین و آسمان بدل دیے۔ اگرچہ میں غالب کے خطوط کو نثری کام شمار نہیں کرتا' مگر اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان سے پہلے خطوط بھی اس عہد کی نثرنگاری ہی کا ایک نمونہ ہوتے تھے۔ وہی القاب و آداب اور عبارت آرائی کے پُرتکلف غلافوں میں اِخفاے ذات کا اہتمام' جو اس عہد کی معیاری ادبی کتابوں کا طرۂ امتیاز تھا' خطوط میں بھی کیا جاتا تھا۔ غالب نے خطوط میں بھی اظہار ذات کا اہتمام کیا اور انھیں بے تکلف مکالمہ بنا دیا' اور اس طرح مکتوب نگاری کی روایت ہی بدل ڈالی۔

اور اب آیئے غالب کی شاعری پر۔ تمام نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ غالب ایک جدت پسند شاعر تھے۔ ان کے کلام نے اردو میں تحلیلی شاعری کا آغاز کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے پہلے اردو کا شاعر جذبے کو جوں کا توں نظم کر دیتا تھا جو ترکیبی شاعری کی خصوصیت ہے۔ غالب نے نہ صرف جذب و خیال کی تحلیل کی بلکہ پہلی بار بے لگام تخیل کو عقل کے ذریعے سڈول بنایا' اور ہر وقت "تصور جاناں" میں بیٹھے رہنے کے خلافِ فطرت ادّعا کو مسترد کر کے غم روزگار کی اہمیت بھی جتائی۔ گویا ان کی بدولت اردو شاعری' جو داستانوں کی طرح خالص وہمی اور خیالی مفروضات کے بل بوتے پر چل رہی تھی' دنیائے آب و گل کی حقیقت کو آنکھیں کھول کر دیکھنے کے قابل بھی ہوئی۔ مثالوں کا یہاں موقع اور گنجایش نہیں' اور نہ اہل علم کے لیے اس کی ضرورت ہی ہے کہ غالب کی عقلیت و واقعیت پسندی ثابت کرنے کے لیے ان کے کلام سے مثالیں دی جائیں۔ بہرحال مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ غالب ہی کی بدولت بعد میں آنے والوں کو یہ آسانی ہوئی کہ مسلم قوم کو تصورات و توہمات سے نکالنے کی جدوجہد کی جائے اور اس طرح دیکھا جائے تو شاہ اسماعیل کی پہلی آواز--- تقلید جامد کو توڑنے اور وہمی' بے اصل عقائد کا پول کھولنے کی کوشش کو شعر کے میدان میں بلند کرنے کا کام غالب ہی نے شروع کیا۔ اور یہ بھی بہرحال ثابت ہے کہ غالب اپنے نہایت گہرے دوست' مگر غیر مشروط تقلید کے علم بردار' مولانا فضل حق خیرآبادی کے بجائے ان کے حریف شاہ اسماعیل سے ذہنی طور پر قریب تھے۔

اس طرح غالب وہ ہستی ہیں جنھوں نے اردو کو ذہن مل جانے کے بعد اسے عقل سے کام لینا سکھایا۔

**تیسری کڑی' سرسید احمد خاں:** انقلاب ۱۸۵۷ء تک ہندی مسلم معاشرے میں اتنی بیداری آگئی تھی کہ اس کے افراد خیالی جنت میں بسے رہنے کے بجائے عقل و ہوش سے کام لے سکیں۔ ادب میں اس کا ثبوت' جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' شاہ شہید اور غالب کی تحریروں سے ملتا ہے۔ اب یہ محض اتفاق نہیں کہ سرسید نے ان دونوں بزرگوں کے کام کو آگے بڑھایا اور اردو ادب کو ایک نیا موڑ دیا۔ یہ معلوم ہے کہ

سرسید کو شاہ صاحب کے وعظ اپنے لڑکپن میں سننے کا اتفاق ہوا تھا، بلکہ ان کا خاندان بھی "شاہی خاندان" (ولی اللّٰہی) کا معتقد تھا۔ نیز، غالب سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ لہٰذا سرسید نے اپنی اصلاحی کوششوں میں ان دونوں سے خاصا استفادہ کیا۔ ان کی تحریر بڑی حد تک تقویت الایمان کا چربا ہے۔ اگرچہ ان کے موضوعات ذرا مختلف ہیں۔ اسی طرح غالب کی سی واقعیت پسندی اور جچی تلی، مختصر مگر جامع عبارت لکھنے کا اہتمام سرسید بھی کرتے ہیں۔ البتہ ان کا کام، مختصر الفاظ میں، یہ ہے کہ انھوں نے اجتماعی عقل کو منظم کیا اور مسلمانوں میں ان کے ایک "ملت" ہونے کا شعور پیدا کیا۔ شاہ اسماعیل کے بعد وہ پہلے ادیب ہیں جن کے مخاطب افراد، گروہ یا طبقے نہیں، پورا ہندی مسلم معاشرہ ہے۔ شاہ صاحب کی مخاطب بھی پوری ملت ہے۔ مگر ایک تو ان کا موضوع ایک ہی ہے اور اس پر بھی انھیں صرف ایک ننھے منے سے رسالے میں قلم فرسائی کا موقع ملا، (ان کی باقی تحریریں فارسی میں ہیں) دوسرے اس کی بھی وسیع پیمانے پر جلد اشاعت نہ ہو سکی۔ برخلاف اس کے، سرسید کے موضوعات اور تصانیف بھی خاصی تعداد میں ہیں اور انھیں اپنی زندگی ہی میں وسیع پیمانے پر ان کی اشاعت کے ذرائع بھی خوب میسر آئے۔

سرسید کے طرز فکر سے آج ہم اختلاف بھی کر سکتے ہیں، مگر ان کے خلوص سے انکار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اسلوب تحریر میں زور، سادگی، قطعیت اور اثرانگیزی اس درجے کی ہے کہ شدید مخالفت کے باوجود ان کی تحریک آگے ہی آگے بڑھتی گئی، اور ان کے انداز بیاں کو ان کے کٹر مخالف بھی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ سرسید ہی تھے جنھوں نے اپنی دنیا میں مگن رہنے والے بقلم خود "اہل زبان" حضرات کی اجارہ داری توڑی، اور نظم و نثر کو ایک چھوٹے سے گروہ کی ملکیت سے نکال کر پورے ملک کی جاگیر بنا دیا۔ انھوں نے دہلی لکھنؤ کے دعوؤں کا جھوٹا طلسم پاش پاش کیا، اور زبان و ادب کا نیا مرکز --- علی گڑھ --- قائم ہوا، جہاں سارے ہندی مسلمانوں کی نمایندگی ہونے کے باعث ایک نیا، باوقار اور صحیح معنوں میں افادی ادب پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور اس ادب کے خالق نہ تو دہلی یا لکھنؤ کے مفتخر نام لیوا تھے اور نہ روایتی "شرفا" کے خاندان سے متعلق۔ اور اس طرح ادب کو عوامی بنانے کا شرف بھی سرسید ہی کو حاصل ہوا۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ سرسید نے اردو ادب میں پیدا ہو جانے والی عقل کو اجتماعی عقل بنا کر منظم کر دیا۔

**چوتھی کڑی، مولانا الطاف حسین حالی**: اگرچہ عام طور پر حالی کو سرسید تحریک سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا، پھر بھی حالی کو سرسید کا نرا تکملہ کہنا درست نہ ہوگا۔ بے شک وہ سرسید سے بہت متاثر اور ان کے معاون تھے، لیکن ادب میں ان کا اپنا مقام، اپنی کارگزاری اور اپنا اسلوب ہے۔ نظم اور نثر دونوں میں ان کا جدا جدا کام ہے اور جدا جدا ہی اس کے اثرات بھی ہوئے ہیں۔ انھوں نے شاعری کو کچھ

نئے قواعد کا پابند بنایا، شعر پرکھنے کے واضح اور معین معیار مقرر کیے، اور سابق شعرا کے برخلاف شعر کو معاشرے کی شعوری نمایندگی دی۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرسید کی بدولت مسلم معاشرے کو اپنے ایک ملت ہونے کا احساس قائم ہو چلا تھا۔ اب حالی نے اسی ملت کا ایک فرد ہونے کے ناتے اپنی شاعری میں وہ باتیں کہیں جو یہ ملت غیر شعوری طور پر جانتی اور چاہتی تھی۔ ملت کا مسلم ہونا، اسلامی اقدار سے اس کا دور ہوتے جانا، اس کا شان دار ماضی اور اس کا قابل افسوس حال---- یہ اور ایسے ہی معاملات و مسائل ہیں جن کو خلوص و دردمندی کے رنگ میں رنگ کر حالی نے شعر کہے۔ ان کی مسدس تو بہرحال ایک شاہکار ہے ہی، جس میں مسلمانوں کے ماضی و حال کا تقابل کر کے انھوں نے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہی ہے، ان کی غزلیں بھی ایک نئی، ابھرتی ہوئی تہذیب کی داغ بیل ڈالتی نظر آتی ہیں۔ دُور از کار تخیل سے پرہیز، لچر لذتیت اور بازاری پن سے اجتناب، شریفانہ وقار اور رکھ رکھاؤ اور جمہوری شعور کا آغاز، یہ تمام خصوصیات غزل میں ہمیں پہلی بار حالی ہی کے ہاں ملتی ہیں۔ اس میں وہ جدید دور کے شائستہ مزاج، متوسط طبقے کے شریف اور مہذب فرد نظر آتے ہیں جس کے تخیل میں مسائل حیات پر تبصرہ اور تجزیہ بھی ملتا ہے اور اپنے عہد کے معاملات کی طرف اشارے بھی، اور اس کے ساتھ ساتھ عشق کا فطری جذبہ بھی، جو سابق شعرا کے برخلاف، مقصود زندگی نہیں، منجملہ دیگر جذبات کے محض ایک جذبہ ہے۔ ان کا محبوب بھی شاہی دور کا مطلق العنان، غیر ذمہ دار، ستم شعار یا زنان بازاری کی طرح پُرتصنع، چھچھوری عادات کا مالک، جنس زدہ شخص نہیں، جمہوری دور کا باکردار فرد ہے جس سے غلط قسم کی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔

اب رہی حالی کی نثر، تو ان کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں جدید زبان لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ وہ زبان ہے جس کا تتبع آج تک کیا جا رہا ہے۔ سرسید تک کے ہاں کسی حد تک پرانی زبان کے اثرات باقی رہ گئے ہیں۔ آوے، جاوے، کرکر اور جملوں کی ساخت میں پرانی طرز کی تقدیم و تاخیر، وغیرہ سرسید بھی بے تکلف لکھ جاتے ہیں، کیونکہ وہ بہرحال دہلی کے قدیم اشراف میں سے تھے اور قدمائی (کلاسیکل) زبان ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ حالی نہ دہلی کے تھے نہ لکھنؤ کے کہ کلاسیکی روایات پر عمل کرنا ان کی مجبوری ہوتا۔ انھوں نے وہ زبان لکھی جو مخصوص طبقات کے بجائے پورے برصغیر کے مسلمانوں کو راس آگئی اور آج بھی نئی ہے۔

دوسرا کارنامہ ان کا ماضی سے رشتہ جوڑنا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا کارنامہ وہ تین سوانح حیات ہیں جو انھوں نے سعدی، غالب اور سرسید کی لکھیں۔ اول تو اردو میں سوانح نگاری کا اس سے پہلے وجود ہی نہ تھا، صرف تذکروں میں ضمنی طور پر بعض قدما کا ذکر آجاتا تھا، اور اس ذکر میں بھی ان بزرگوں کی واضح تصویر تو درکنار، مدح سرائی کی لفاظی میں ان کی انفرادیت بھی نظر نہ آتی تھی۔ حالی نے اپنی تصانیف میں

اپنے ممدوحوں کو ایسے زندہ و متحرک بنا کر دکھا دیا کہ ہر دور کا قاری ان سے اپنا رشتہ تلاش کر سکتا ہے۔ یہ تینوں اشخاص (سعدی، غالب، سرسید) حالی کے ہاں فوق البشر اور ناقابل ادراک مقدس بن کر نہیں نمودار ہوتے بلکہ اسی جہان آب و گل کے رہنے والے گوشت پوست کے انسان بن کر ہم سے متعارف ہوتے ہیں، اور ہم سے اندھی عقیدت کے بجائے باشعور محبت اور سچے احترام کے طالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح حالی کا مقدمہ شعروشاعری ہمیں اپنے صدیوں پر پھیلے ہوئے ادبی سرمائے پر صحیح، متوازن اور ٹھوس استحسانی نظر ڈالنے کا ڈھب سکھاتا ہے، تاکہ ہم ماضی کو بتوں کی طرح طاقوں میں سجا کر اس کے آگے ڈنڈوت کرتے رہنے کے بجائے اس سے استفادہ کریں، اس کی خوبیوں کو اپنائیں اور اس کی خامیوں سے سبق لیں۔ دوسرے الفاظ میں، حالی کا مقدمہ ہمیں کاغذی نہیں، سچ مچ کے پھولوں کا گلدستہ پیش کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ ماضی کا ادب تبرک نہیں جسے چوم کر آنکھوں سے لگا لینا ہی ہمارا فرض ہو، بلکہ وہ ہماری میراث ہے جسے مسلسل سنوارتے رہنا ہماری ضرورت ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس ہندی معاشرے کو سرسید نے ادب میں منظم عقل بخشی تھی، حالی نے اسے ادب میں اس عقل سے کام لینا اور اجتماعی ہمدردی کے لیے کام کرنا سکھایا۔

**پانچویں کڑی، مولانا شبلی نعمانی:** حالی تک پہنچتے پہنچتے ہمارا ادب شعور اور عقل سے بہرہ ور ہو چکا تھا۔ اب ضرورت تھی علم کی، کیونکہ شعور اور عقل کا ارتقا علم کے بغیر ناممکن ہے اور علم کے لیے تحقیق و کاوش کے علاوہ دقت نظر اور صحیح قوت فیصلہ ضروری ہے۔ یہ تمام اوصاف ادب میں پہلی بار داخل کرنے والی ہستی مولانا شبلی تھے۔ ان سے پہلے اگرچہ حالی اور محمد حسین آزاد بھی اس سلسلے میں کچھ کام کر چکے تھے مگر خالص علمی نقطۂ نظر سے اس کی اتنی اہمیت نہیں۔ حالی نے تین سوانح لکھیں۔ جن میں سے دو ان اشخاص سے متعلق تھیں جن سے حالی کے براہ راست تعلقات تھے اور ان میں انھیں تحقیق یا ریسرچ کی نوبت کم ہی آئی اور آزاد کی تحقیق کا زیادہ تر دائرہ کار لسانیات، بالخصوص فارسی زبان میں ہے، جس کی افادیت کم از کم اس زمانے میں--- یعنی جب اردو ادب اپنے بالکل ابتدائی ارتقا کے مراحل میں تھا--- برائے نام تھی۔ ان کے برخلاف شبلی نے تحقیق و تاریخ نگاری کا ایک بلند معیار قائم کیا اور تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا، ماضی سے جو رشتہ حالی نے جوڑنے کی ابتدا کی تھی اسے مستحکم کیا اور صرف شعروادب ہی کے ذکر پر بس نہ کی بلکہ مسلمانوں کی تقریباً تمام اہم فکری و عملی کاوشوں کو اردو میں منتقل کرنے کا باب وا کر دیا۔ اپنے کام کو جاری رکھنے کی غرض سے ایسے ادارے قائم کیے جو آج تک ان کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر کام کر رہے ہیں، بلکہ ان کی تحریک سے ویسے ہی دیگر ادارے بھی ملک میں قائم ہوتے چلے گئے اور ان سب باتوں کے علاوہ تحریر کا وہ اسلوب ایجاد کیا جو بیک وقت علمی و ادبی تھا۔ اس میں سرسید کی سی قطعیت اور زور

استدلال، حالی کی سی سادگی و روانی اور شاہ اسماعیل کی سی گرمی گفتار بھی تھی اور خود ان کی اپنی شگفتگی، عالمانہ وقار اور بالغ نظری جسے عربیت کے ذوق نے جوامع الکلم کی خصوصیات بھی دے دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا ادب حالی کی نسبت شبلی سے زیادہ متاثر ہوا ہے، اور ہمارے ادب کے مؤرخوں نے شبلی کی "مذہبیت" کے باوجود انھیں ادبی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام دیا ہے، گویا وہ پہلے مولوی ہیں جنھیں "ادیب" بھی تسلیم کیا گیا۔ ان سے ذرا پہلے ڈاکٹر نذیر احمد بھی مولوی تھے، لیکن ادب میں ان کی مولویت دبی ہوئی ہے اور دینی موضوعات میں سے ایک آدھ ہی پر انھوں نے کچھ کام کیا ہے اور وہ بھی اتنا معروف و مقبول نہیں ہوا۔ بہرصورت ادب میں دین و دنیا کی جو تفریق اوپر سے مسلم چلی آ رہی تھی، اسے پہلے شاہ شہید نے مٹانے کا کام کیا، لیکن اس کی تکمیل شبلی کے ہاتھوں ہوئی۔

شبلی کی تصانیف و موضوعات کا سلسلہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ چند سطور میں اس کا اجمالی ذکر بھی مشکل ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی بدولت اردو ادب میں بالفاظ اقبال "عجم کا حسن طبیعت" اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔ اور ان کی تصانیف نے ہمارے اندر مسلم ملت ہونے کا واضح شعور اپنے اسلاف سے رشتہ جوڑ کر پیدا کیا۔

**چھٹی کڑی، علامہ محمد اقبال:** یوں تو اقبال کو ہمارے علما، ادبا، شعرا سے لے کر عوام کے ایک ایک فرد تک اپنا ملی شاعر مان کر اس پر فخر کرتے ہیں، لیکن ان کی توصیف و تحسین کا بیشتر حصہ جذباتی اور بے مصرف ہوتا ہے۔ بہت کم حضرات نے سنجیدگی سے اقبال کے حقیقی کارنامے اور ملت پر اس کے احسان کا جائزہ لیا ہے، اور اس طرف تو بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے کہ اقبال کے افکار و تخیل کی تشکیل میں اردو ادب کے گذشتہ ارتقائی مراحل کا اصل حصہ ہے۔ لوگوں نے اقبال کا ذہنی رشتہ نطشے، رومی، برگسان وغیرہ سے جوڑنے میں تو خاصی محنت سے کام لیا، لیکن اس پر غور نہ کیا کہ خود اردو ادب میں ان سے پہلے گزرنے والے اساطین نے ان کے لیے کیا ترکہ چھوڑا، جسے انھوں نے مزید ترقی اور جلا بخشی۔ درحقیقت اقبال کو اپنے ان ادبی اسلاف--- حالی، شبلی اور سرسید سے جو کچھ ملا اسی پر انھوں نے اپنی شاعری اور فکر کی عمارت اٹھائی۔ بیرونی مفکرین نے تو محض اس عمارت کو تقویت دینے کا مسالہ ہی مہیا کیا۔

اقبال تک پہنچتے پہنچتے، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اردو ادب نے برصغیر کے مسلمانوں کو عقل، فکر، علم اور ملی احساس کی نعمتیں عطا کر دی تھیں۔ اب ادب ذہنی عیاشی یا تقلیدی عقائد کو مستحکم کرنے والی چیز نہیں رہ گیا تھا۔ مسلم ملت کو اپنی زبوں حالی اور زیاں کاری کا اندازہ ہو چلا تھا۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہو چلے تھے کہ برصغیر میں صدیاں بسر کر چکنے کے باوجود ان کا قلبی و ذہنی تعلق اسلام کے سرچشمے سرزمین حجاز سے ہونے کے باعث وہ آج بھی اس ملک میں اجنبی ہیں، اور انھیں اپنا تشخص اتنا عزیز ہے کہ وہ

دوسری (نسلی) قومیتوں کی طرح اس کان نمک میں نمک بن جانے پر آمادہ نہیں۔ اب وہ غیر شعوری طور پر اس بات کے طالب تھے کہ انھیں کوئی ایسی تدبیر سجھائی جائے جس سے وہ الگ تشخص رکھتے ہوئے اپنا وجود منوا سکیں اور اس پر فخر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب مسلمان اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھ سکیں' اور یہ جان لیں کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح محض ایک نسلی' تہذیبی یا جغرافیائی نسبت سے ایک قوم نہیں بلکہ ایک اصولی ملت ہیں اور اس اعتبار سے ان کی انفرادیت تبھی برقرار رہ سکتی ہے جب وہ ان تنگ حد بندیوں (نسل' رنگ وغیرہ) سے آزاد ہو کر اپنا بین الاقوامی بلکہ بین الانسانی ہونا اچھی طرح معلوم کرلیں' بالفاظ دیگر' اپنی خودی پہچان لیں۔

یہ تسلسل افکار کا ایک منطقی نتیجہ تھا جسے اب تک کوئی ادیب یا مفکر شعوری طور پر نہ سمجھ پایا تھا' کیونکہ اس کے لیے پچھلی صدی تک حالات سازگار نہ تھے۔ البتہ بیسویں صدی آنے کے بعد اردو ادب کا فکری سفر اس منزل تک جاری رکھنے کے لیے ایک ذہین' فلسفی اور صاحبِ دل مزاج شناسِ ملت کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت اقبال نے پوری کر دی۔ ان کے ابتدائی کلام سے اخیر تک کی شاعری میں ان کے ارتقاے تفکر کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کو محض نام کا مسلمان سمجھنے کے بجائے "حقائق ابدی کی اساس" یاد دلانا اور وقت کے تازہ خدا "قومیت" یا "وطنیت" کی پرستش سے باز رکھنے کی کوشش کرنا' اور اس کے بجائے "حرم کی پاسبانی" پر اکسانا' اقبال نے پورے دانشورانہ اور فلسفیانہ سلسلہ استدلال کے ذریعے حق سمجھ کر اپنا مشن بنایا۔ ان کی بدولت ادب میں خیالات کی جو نئی انقلابی رو داخل ہوئی وہ صحیح معنوں میں سرسید تحریک کو نیا موڑ دکھانے والی ثابت ہوئی۔ اقبال کے کارنامے کو مختصراً اس طرح سمیٹا جا سکتا ہے کہ:

(۱) اقبال نے تنگ قومیت سے نکل کر مسلمانوں کو بین الاسلامی ملت کا جز ہونے کا احساس دلایا۔

(۲) تصوف اور غلامی (اپنے بادشاہوں' اکابر یا غیر ملکی آقاؤں سب کی غلامی) نے جمود اور منفی اخلاقیات میں مسلمانوں کو جکڑ رکھا تھا' اقبال نے اس سے نجات پانے کا راستہ خودشناسی کے ذریعے سکھایا۔

(۳) مخالفت سے مزاحم ہونا اور شر سے ٹکرا کر ختم ہو جانے کے بجائے ردعمل کے طور پر خیر کی طرف بڑھنے کی دعوت دی۔ گویا وسعت پذیری' خود اعتمادی اور ردعمل--- یہ وہ اہم ترین رجحانات تھے جو اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت کو سکھائے اور اس پر مستزاد' روشن مستقبل پر یقین کامل کا تحفہ بھی عطا کیا' جو اس اعتبار سے اہم ترین ہے کہ یہ محض نعرہ بازی یا کھوکھلی جذباتیت کی پیداوار نہیں' ایک فطری اور منطقی نتیجہ تھا' اس تسلسل افکار کا جو اقبال پیش کر رہے تھے اور اسی لیے اقبال کو مستقبل کا شاعر بھی کہا گیا ہے۔

میں نے نہایت سرسری اور اجمالی خاکہ اردو ادب کا گذشتہ اوراق میں پیش کیا ہے' اور اگر حالات نے

اجازت دی یا اس پر اہل علم نے بحث کا دروازہ کھولا تو اس کی تفصیلات میں بھی جایا جا سکتا ہے۔ البتہ ہمارے ادب کی تاریخ جس طرح میرے نزدیک وقفے وقفے کے بعد اہم تر موڑ مڑتی آ رہی ہے اس نہج پر آج تک ہمارے مورخین ادب نے اسے مدون و مرتب نہ کر کے ادب کے طالب علموں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ تاریخ صرف واقعات کی کھتونی نہیں ہوتی، وہ ایک محافظ خانہ، ایک رجحان پیما اور ایک آیندہ کا مشیر (indicator) بھی ہوتی ہے، جس کے مطالعے سے واضح طور پر اپنا ماضی مربوط اور مسلسل صورت میں جان کر ہم اپنے مستقبل کی بھی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ کاش اردو ادب کی تاریخ بھی اس نہج پر مرتب کی گئی ہوتی۔ آج ہم مولانا مودودیؒ جیسے ادیب کو تاریخ ادب میں نمایاں، بلکہ انقلابی مقام دینے کی جسارت کر رہے ہیں، تو ہمیں خود احساس ہے کہ مورخین و نقادان ادب کی محفل سے خود کو بالکل الگ تھلگ اور تنہا پا رہے ہیں اور گویا بظاہر یہ ایک "اوپری اوپری" سی بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن اگر دوسری زبانوں کی طرح اردو کی تاریخ بھی افکار و تخیلات کی صحیح، سائنسی شعبہ بندی کے مطابق کی جاتی تو یہ اوپرے پن کا احساس نہ ہوتا۔

**آخری کڑی، سید ابوالاعلیٰ مودودی:** سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے متعلق آج دنیاے اسلام کا بچہ بچہ اور بقیہ دنیا کا بھی بیشتر حصہ واقف ہے کہ وہ ایک تاریخ ساز ہستی تھے۔ ان کے افکار، ان کا قوی ایمان، ان کی بے نظیر تربیت و تزکیہ نفس، ان کی تنظیمی صلاحیت، غرض جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو صدیوں میں خوش قسمتی ہی سے کسی قوم کے حصے میں آجاتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہاں ان کی تمام دوسری وہبی اور اکتسابی صلاحیتوں سے قطع نظر کر کے صرف ان کی ادبی حیثیت متعین کرنی ہے۔

اوپر ہم پڑھ چکے ہیں کہ اقبال نے ادب کو "اسلامیت" کا تخیل دیا جو ان سے پہلے "مسلم قومیت" سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں کے اہم مگر نازک فرق کو عوام تک پہنچانے اور واضح کرنے کی ضرورت تھی کہ مسلم قومیت کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اسلامیت کے بالکل دوسرے۔ لیکن یہ کام نہ تو اقبال نے کیا، نہ یہ ان کے کرنے کا تھا۔ وہ ایک تصور کی اصلاح کر رہے تھے، اور اس کے لیے انھوں نے شعر کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ استعارے کی زبان میں، انھوں نے پٹڑی سے اتری ہوئی ٹرین کو پٹڑی پر رکھنے کا کام کیا تھا، جو ایک کرین کرتی ہے۔ اس کرین سے ریلوے انجن کا کام کسی طرح نہیں لیا جا سکتا کہ وہ گاڑی کو صحیح سمت میں لے بھی چلے۔ اس کے لیے قدرت الٰہی نے ایک نثرنگار کو پیدا کیا۔ کیونکہ جو چیز نظم میں مجمل اور محدود ہوتی ہے وہی نثر میں مفصل اور لامحدود طور پر ادا کی جا سکتی ہے۔

اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعے ملت کو جو شعور ذات بخشا تھا وہ اپنی جگہ تھا تو بالکل صحیح، مگر اس کی تفصیلات پر، انھوں نے کچھ نہ کہا۔ وہ اگر کہنے کے اہل بھی ہوتے تو نہ کہہ سکتے تھے۔ اول تو نظم کا یہ کام ہی

نہیں کہ تفصیلات مہیا کرے، دوسرے یہ ایک نئی آواز تھی۔ یہ جب تک ملت کو اچھی طرح ہضم نہ ہو جاتی، اس کی تفصیلات بتانے کی گنجایش ہی نہیں نکل سکتی تھی۔ اقبال نے صرف اس طرف اشارہ کر کے ہی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ لیکن اقبال کے اس "ماٹو" کو واضح کرنے کا فرض جس ہستی نے انجام دیا، وہ مودودیؒ کے سوا کوئی نہ تھا۔

مولانا مودودیؒ کا سارا لٹریچر جس قسم کے افکار، دلائل اور مباحث سے لبریز ہے اس پر تبصرہ کرنا تو مولانا کے عمومی سوانح نگار یا فکر اسلامی کے مورخ کا کام ہے۔ ہمیں یہاں صرف اس کے ادبی پہلو سے غرض ہے۔ اس سے پہلے ہم نے دیکھا کہ شبلی نے ادب کو دین میں سمو دیا تھا اور اس طرح وہ پہلے مصنف بن گئے تھے جو مولوی ہو کر بھی ادیب کہلائے۔ ان کے بعد یہ سعادت صحیح معنوں میں مولانا مودودی کے حصے میں آتی ہے، جنھوں نے ادب کا وہ اسلوب اختیار کیا جس کو عوام و خواص سب پڑھ کر ادبی حظ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ فلسفہ اسلام پیش کرتے ہیں مگر افسانے کی سی لطافت اسے پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ سیاسی موضوعات پر بحث کرتے ہیں مگر اس میں کہانی کا لطف آتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو تقویٰ اختیار کرنے پر راغب کرتے ہیں مگر اسے دل کش نظم کی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ غرض وہ جو بات بھی لکھتے ہیں اس میں ادبی خوبیاں اور فکری لطافتیں سموئی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کی زبان عہد حاضر کی بے تکلف، رواں اور گوارا زبان ہے، جسے مقامی محاوروں یا اصطلاحوں سے دل کشی مستعار لینے کی ضرورت نہیں۔ ان کے افکار دینی ہیں لیکن دینی مکاتب فکر کی روایتی مصطلحات سے پاک عبارت میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کا اسلوب متین و باوقار ہے، مگر مولویانہ گراں بار اور پُر تکلف طرز اظہار کا اس میں دخل نہیں اور کیوں نہ ہو، انھوں نے دین کو اپنی پوری زندگی پر حاوی کرنے کی دعوت دی تھی۔ دین و دنیا کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا تھا، جیسے ان سے قبل علما کا شیوہ تھا اور اسی لیے ان کی دینی تحریر اور گھریلو گفتگو میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا تھا۔ مولانا کی زندگی ہی جب دین کے تابع تھی تو ان کی دینی اور گھریلو تقریر میں کوئی فرق نہ ہو سکتا تھا۔ انھی کی تحریروں سے ایک طرف اہل دین نے یہ سیکھا کہ دینی موضوعات پر بھی افسانے کی زبان میں قلم فرسائی کی جا سکتی ہے تو دوسری طرف اہل دنیا کو معلوم ہوا کہ دینی تحریر بھی ادبی دل چسپی رکھ سکتی ہے۔ شبلی کے ہاں بھی یہ دل چسپی ہے، مگر اس کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ دین کے کسی موضوع پر علمی استفادہ کر لیا جائے۔ برخلاف اس کے، مولانا کی تحریر سے دل و دماغ متاثر ہو کر عملاً اپنے رجحانات زندگی کو بدلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

مولانا کے ہاں میں نے دو اسالیب بہت واضح طور پر جدا جدا پائے۔ ایک ان کی نوجوانی کا دور ہے، جس میں روانی اور زور بیان اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس میں استدلال اور سنجیدگی تو ہے مگر شعلے کی سی لپک۔

اور طوفان کا سا دبدبہ بھی ہے۔ وہ قاری پر بجلی اور آندھی کی طرح چھا جاتے ہیں۔ یہ کیفیت سرسید کی تحریروں میں بھی ملتی ہے مگر اس میں کسی قدر گرانی اور پرانا پن ہے' جس سے مولانا کی تحریر پاک ہے اور اس طرح بھرپور تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ البتہ عمر اور تحریک اسلامی کی قیادت کی ذمہ داریاں بڑھ جانے کے بعد ان کا دوسرا اسلوب پیدا ہوا جس میں اعتماد اور ٹھہراؤ کی فضا ملتی ہے۔ اس فرق کے علاوہ باقی تمام خصوصیات ان دونوں اسالیب کی یکساں ہیں۔

مولانا نے اپنے پیش روؤں سے پورا پورا استفادہ کیا تھا۔ اس لیے ان کی تمام خوبیاں اپنانے اور خامیاں ترک کرنے کا موقع بھی انھیں اچھی طرح ملا اور ایک سچے ادیب کی طرح انھوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اسی لیے تو ان کی تحریر ان تمام بزرگوں کی خصوصیات اپنے اندر لیے ہوئے ہے' اور اس کا اثر بھی ہمہ گیر ہے۔ آج ہم مولانا کی تحریروں کے اثرات کا حقیقی اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ اگرچہ اس وقت غالباً انھی کی تصانیف سب سے زیادہ پڑھی جانے والی ہیں' اور ان کے متعدد زبانوں میں تراجم ہو جانے کے بعد بیرونی دنیا کے لوگ بھی ان سے آشنا ہو گئے ہیں' لیکن ان سے اثرپذیری کا جائزہ افکار کی حد تک لیا جا سکتا ہے۔ البتہ آیندہ جب ہمارے بعد آنے والی نسلیں یہ دیکھیں گی کہ اردو کے ادیبوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مولانا کا کتنے وسیع پیمانے پر اپنی نگارشات میں اتباع اسلوب کیا ہے' تبھی یہ جائزہ لیا جا سکے گا' ویسے اس کے اثرات کچھ نہ کچھ نمودار ہونے بھی لگے ہیں۔ "اہل مدرسہ" نے اپنی تحریروں کو رواں' شگفتہ اور بے تکلف بنانے کی سعی شروع کر دی ہے اور اہل میکدہ نے بے راہ روی اور غیرذمہ داری سے احتراز کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب پورا مسلم معاشرہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اس رنگ میں رنگ جائے گا جسے مولانا نے مسلم ملت کا آئیڈیل قرار دیا ہے--- اور واقعہ یہ ہے کہ معاشرہ اس سمت میں کچھ نہ کچھ پیش رفت کر بھی رہا ہے' تو اس دور کا ادیب بھی خود بخود یہی اسلوب اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور تبھی اس جائزے کی نوبت آئے گی کہ سِلسلۃُ الذَّھَب کی اس آخری کڑی نے ادب پر کیا اور کتنے گہرے اثرات چھوڑے۔

سید مودودیؒ سے قبل اردو ادب ہر طرح کے اصناف اور شعبوں سے آشنا ہو چکا تھا' ہر قسم کے اسالیب اور انداز ہائے بیان اس میں داخل کیے جا چکے تھے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان سب خصوصیات کو یکجا کر کے فکر اسلامی کا تابع بنا دیا جائے۔ یہ کام سید موصوف نے کر دکھایا اور اب اس نمونے پر لکھنے والے آہستہ آہستہ تعداد اور کیفیت دونوں میں بڑھتے جا رہے ہیں اور اب بظاہر کسی نئے انقلابی ادیب کے آنے کے آثار ہیں نہ گنجایش۔

# جمہوریت اور امریکی حکمت عملی

عبدالکریم عابد ○

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک جمہوریت کو امرت دھارا سمجھا جاتا تھا کہ یہ ہاتھ آجائے تو مشکل کشا ثابت ہوگی اور ملک و قوم کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ لیکن اب جمہوریت پر ایمان اور اعتقاد کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور نہ صرف عوام بلکہ اہل دانش بھی پریشان ہیں کہ نہ فوجی آمریت میں ہمارا بھلا ہوا نہ بار بار کے انتخابات سے ہماری تقدیر بدلی۔ جسد قومی پر آمریت نے جو زخم لگائے اس سے بڑھ کر جمہوریت نے چرکے لگائے ہیں۔ ایسی صورت میں اب کیا ہو؟

جمہوریت کے بارے میں مایوسی کا پہلا کھلم کھلا اظہار ممتاز دولتانہ نے اپنے ایک آخری انٹرویو میں کیا' تاہم نظری طور پر وہ ہمیشہ جمہوریت کے وکیل رہے۔ ایوب خان کی کنونشن لیگ اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو انھوں نے قبول نہ کیا۔ جمہوریت کے لیے جو اتحاد بنے' اس میں بھی ان کا کردار رہا ہے۔ لیکن آخری وقت میں' انھوں نے ۱۹۸۷ء میں ایک انٹرویو دیا' اس میں انھوں نے حالت یاس میں کہا:

> میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید اب ہماری قوم کا مزاج جمہوری نہیں رہا اور بعض غیر جمہوری ممالک اگر جمہوریت کے بغیر مستحکم ہو گئے ہیں' تو پاکستان کو بھی اسی انداز میں چلا کر دیکھ لیا جائے۔ ممکن ہے ملک کے عوام کا مزاج ہی ایسا ہو اور یہاں کے لوگوں نے غیر جمہوری ماحول کو قبول کر لیا ہو۔ اب جو ماحول پاکستان کے عوام پسند کرتے ہیں' اسے ہی اپنا لینا چاہیے۔ میں نے تو ان باتوں کی طرف سے اب اپنا دل چھوڑ دیا ہے۔ اگرچہ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا کہ پاکستان کو جمہوریت کے بغیر نہیں چلایا جا سکتا۔

جمہوریت سے یہ مایوسی تقریباً انھی سب حضرات کو ہوئی ہے جو آمریتوں کے دور میں جمہوریت کے لیے اتحاد قائم کرتے رہے اور جمہوریت کی خاطر نعرہ زن رہے۔ ضیاء الحق کے دور تک جمہوریت کے

---

○ چیف ایڈیٹر' ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل' کراچی

نعرے میں کشش تھی' اس کے بعد جب قوم نے بے نظیر اور نواز شریف کی جمہوریت کو دیکھا تو یہی جمہوریت پسند دوبارہ فوج سے توقعات قائم کر بیٹھے اور آوازیں دینے لگے کہ وہ زمام اقتدار سنبھال کر ملک کو بچائے۔ اس خواہش کے مطابق جنرل پرویز مشرف آئے ہیں لیکن لوگ واقعی دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ نہ فوج سے انھیں توقع رہی ہے اور نہ الیکشن میں انھیں ملک کے مصائب اور مسائل کا حل نظر آتا ہے۔

قومی سطح سے ہٹ کر جب ہم اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں تو بھارت کی جمہوریت کا ایک تسلسل ہے' لیکن اس جمہوریت کا انجام بھی ہمارے لیے جمہوریت کی طرف ترغیب دینے والا نہیں ہے۔ نصف صدی کی اس جمہوریت میں قومی جماعت کانگریس برباد ہوئی اور اس کی جگہ دوسری قومی جماعت نہیں لے سکی۔ فرقہ پرست اور علاقائی پارٹیوں کا اقتدار ہے اور بہار' یوپی' بھوپال' راجستھان میں جمہوریت کے نام پر ہنسانے اور رلانے والے تماشے ہو رہے ہیں۔ قاتل' ڈاکو اور جرائم پیشہ سیاسی ایوانوں کے اراکین ہیں۔ جمہوریت نے رواداری کے ذہن کی جگہ تعصب کو انتہا پر پہنچا دیا ہے۔ معاشی طور پر غیر ملکی سرمایہ کاروں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی گرفت قائم ہو رہی ہے۔ اخلاقی لحاظ سے فلم' ٹی وی کی بے حیائی ہے۔ وہ کانگریس جس نے ترک منکرات یا امتناع شراب کی تحریک چلائی تھی' اس کے ملک میں چائے خانوں سے زیادہ شراب خانے ہیں اور شراب بھی وہ زہریلی شراب جو آدمی کو جلد قبر تک پہنچا دیتی ہے۔ عصمت فروشی کے بازاروں میں ایڈز' تپ دق' جذام کے امراض' غربت کے دردناک مناظر' نیچ ذات کے لوگوں پر مظالم میں اضافہ' مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کے خلاف بھی تعصب کی آگ' شیوسینا' بجرنگ دل' وشوا ہندو پریشد' راشٹریہ سیوک سنگھ کا زور' آسام اور مشرقی علاقوں میں علیحدگی پسندوں کا چائے کے باغات اور چائے کی کمپنیوں سے بھتہ وصول کرنا اور سرکاری آدمیوں کو قتل کرنا اور سب سے بڑھ کر جموں و کشمیر کا خونی منظر۔ یہ بھارتی جمہوریت کے تحائف ہیں۔ بھارت کے مقابلے میں چین' جہاں جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق نہیں ہیں' سیاسی استحکام' معاشی ترقی اور اخلاقی و سماجی حالت کے لحاظ سے کہیں بہتر حالت میں ہے۔ اب تو خود بھارتی دانش ور اس بھارتی جمہوریت سے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔

دنیا کے ایک بڑے مسلم ملک انڈونیشیا میں بھی امریکہ سہارتو کی ۳۰ سالہ آمریت کے بعد جمہوریت لایا ہے۔ لیکن اس جمہوریت کا پہلا تحفہ مشرقی تیمور کی علیحدگی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے جزائر میں بھی آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ عیسائی مسلم فسادات عام ہو گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن واحد کو صدر بنایا گیا تھا۔ اب انھیں دھکا دے کر سوئیکارنو کی بیٹی میگاوتی کو آگے لایا جا رہا ہے۔ میگاوتی کی جماعت نے الیکشن میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کی تھیں' لیکن قطعی اکثریت نہیں تھی۔ اس لیے مخلوط حکومت میں عبدالرحمٰن واحد صدر ہو گئے۔ اب ان کے حامی میگاوتی سے مل رہے ہیں اور انڈونیشیا نہ صرف مغربی

سازش بلکہ مسیحی سازش کی زد میں ہے۔

روس میں کمیونسٹ نظام کی شکست کے بعد وہاں بھی جمہوریت کے نام پر پہلے صدر بورس یلسن آمر بن گئے، اب پیوٹن مرکز کو مضبوط بنانے کے نام پر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے چکے ہیں۔ معیشت برباد ہے اور روسی عوام پچھلے دنوں کو سرد آہیں بھر کر یاد کرتے ہیں کہ جب آزادی نہیں تھی مگر معاشی اطمینان تھا، ملک کی سوپرپاور کی حیثیت سے عزت تھی۔ اب امریکہ نے جو جمہوریت دی ہے، اس کے نتیجے میں معاشی نکبت بھی ہے اور قومی ذلت بھی۔

جمہوریت کی مخالفت نہیں ہونی چاہیے، نہ فوجی آمریت کو گوارا کیا جانا چاہیے لیکن یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ آخر امریکہ اچانک آمریت پسند سے جمہوریت پسند کیوں ہو گیا؟ اور یہ جو وہ جمہوریت کا جام گردش میں لایا ہے، یا لانا چاہتا ہے اور ہمارے لبوں کے آگے پیش کیا جا رہا ہے، اس شراب میں ساقی نے کچھ ملا تو نہیں دیا؟

امریکی حکمت عملی کے بعض مقاصد تو واضح ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ ہماری معیشت پر اس کا اور اس کے مالیاتی اداروں کا کنٹرول رہے۔ یہ ملک حقیقی صنعتی ترقی نہ کرے۔ جو چند صنعتیں نظر آ رہی ہیں اس سے بھی وہ دستبردار ہو جائے۔ کیونکہ امریکہ کا مشورہ ہے کہ عالمی منڈی میں آپ کی سٹیل، سیمنٹ، کھاد کاروں اور ایسی دوسری بہت سی صنعتیں مقابلے کے قابل نہیں ہیں اور اب جب کہ آپ نے غیر ملکی مال پر بتدریج ڈیوٹیاں کم کرنے کا معاہدہ کر لیا ہے اور اس پر عمل بھی کر رہے ہیں تو ان صنعتوں کا مستقبل نہیں۔ انھیں ختم کریں اور صرف خام مال پیدا کرنے پر توجہ مرکوز کریں۔ صنعتی اشیا آپ کو باہر سے بہت سستے داموں مل جائیں گی اور خام مال کی قیمتیں بھی کرنسی کی قدر میں کمی کے ساتھ سال بہ سال کم ہوتی جائیں گی۔ امریکی حکمت عملی کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ فوج کے ادارے کو کمزور کیا جائے۔ وہ کسی اہم اور فیصلہ کن حیثیت میں نہ رہے۔ جس طرح روس میں فوج ذلیل ہوئی ہے اور کئی کئی ماہ تک اسے تنخواہ بھی نہیں ملتی ہے، یہی صورت پاکستانی فوج کی ہو۔ فوج کی اس طاقت کو کم کرنے کے لیے امریکی نسخے میں دو چیزیں ہیں: ایک جمہوریت، دوسری علاقائی خودمختاری۔ دونوں باتیں صحیح ہیں لیکن امریکہ کا کمال یہ ہے کہ وہ صحیح باتوں کو ہی اپنے غلط مقصد کے لیے استعمال کرتا اور ترتیب دیتا ہے۔ سچائی سے جھوٹ کی جو خدمت لیتا ہے اس پر یقیناً شیطان بھی عش عش کر رہا ہو گا۔

امریکہ کے خیال میں برعظیم میں مذہبی بنیاد پر تقسیم غلط تھی اور جب تک یہ تقسیم قائم ہے بھارت اور پاکستان ہندو نیشنلزم اور مسلم نیشنلزم ہی کی اساس پر قائم رہیں گے اور ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں گے۔ آپس میں میل ملاپ کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اس لیے اس ہندو مسلم کی بنیاد کو

منہدم کر کے برعظیم کی جدید تشکیل علاقائیت و لسانیت پر کرنی چاہیے۔ اس کے لیے کشمیر کو عنوان بنایا جا سکتا ہے اور بھارت کو ریاست ہائے متحدہ ہندستان کی طرز کا نظام اختیار کرنے پر دھکیلا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں علاقائی پارٹیاں پہلے ہی وہاں صوبائی حکومتوں میں ہیں اور کشمیر کو خودمختاری دینے سے ان صوبوں کے لیے بھی اس کی شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ اب بھی امریکہ بھارتی ریاستوں سے الگ الگ اقتصادی معاہدے کر رہا ہے (جس کی پاکستان میں اجازت نہیں ہے، لیکن شہباز شریف نے یہ حق مانگا تھا)۔ ہندستان کے آئینی ڈھانچے میں تبدیلی کے بعد بھارتی ریاستوں کے امریکہ اور ملٹی نیشنل اداروں سے براہ راست تعلقات اور بھی زیادہ ترقی کر جائیں گے۔ مرکز اس میں حارج نہیں ہو سکے گا۔

پاکستان کو بھی کنفیڈریشن کی طرف دھکیلنا مقصود ہے۔ اس کے لیے پہلے ضلعی حکومتوں کے ذریعے صوبے فیڈریشن میں تبدیل ہوں گے۔ پھر یہ فیڈریشن سے کنفیڈریشن بنیں گے۔ کنفیڈریشن کا مرکز کمزور ہو گا، فیڈریشن اس کے مقابلے پر ہو گی اور فیڈریشن کے مقابلے پر ضلعی حکومتیں ہوں گی اور ان سب کی کمزوریوں کا فائدہ امریکہ اور ملٹی نیشنل عالمی ادارے حاصل کریں گے۔ اس مقصد کے لیے علاقائی قوتوں کو آگے لایا جا رہا ہے، ان میں ٹکراؤ پیدا کیا جا رہا ہے اور ملک کو ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق میں تبدیل کرنے کا ارادہ ہے۔ اس وفاق میں سیاسی حکومتیں کمزور اور غیر مستحکم حالت میں ہوں، یہ وقفے وقفے سے بدلتی رہیں، مستقل سیاسی اکھاڑ پچھاڑ برپا رہے اور کمزور حالت میں، یہ امریکہ کے لیے چیلنج نہ رہیں۔ فوج تو پہلے ہی بے اثر کر دی جائے گی۔ علاقائی و لسانی بنیاد پر ملک کی نئی تعمیر سے اسلامی تحریک کا راستہ بھی روکا جا سکے گا، جو امریکہ کی نظر میں روس کے بعد اب سب سے بڑا خطرہ ہے۔ امریکہ اپنے زیراثر ممالک میں آمریت بھی ایسی چاہتا تھا کہ جب اس آمریت کے سرپرست کی حیثیت سے امریکی ہاتھ اٹھ جائے تو یہ دھڑام سے زمین پر آن گرے۔ اسی طرح اب وہ جمہوریت بھی ایسی چاہتا ہے جس میں انتشار اور خانہ جنگی کے جراثیم پرورش پا سکیں اور جہاں اکثریتی جماعت کا انحصار عوام کے بجائے سامراج پر ہو۔ اور اقلیتی جماعتیں وہ ہوں، جو امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قطار میں کھڑی ہوں کہ کب ہم پر نظر کرم ہوتی ہے۔

امریکہ کی اس سامراجی جمہوریت کا ہماری ثقافتی تخریب کاری کے مقصد سے بھی گہرا تعلق ہے۔ امریکہ کو یقین ہے کہ جمہوریت کے ماحول میں وہ عناصر ابھر کر آئیں گے، جو ایک نئی ثقافت کے مظاہر پیش کر کے ہماری ثقافتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو تیز تر کر دیں گے۔ اس لیے آیندہ کی جمہوریت میں امریکہ کی حسب مطلب این جی اوز کا بڑا حصہ ہوگا۔

یہ امر بھی غور طلب ہے کہ مغربی جمہوریت کیا چیز ہے، اس کی پیدایش کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اب جب کہ مغربی ملکوں میں یہ جمہوریت برسرکار ہے تو اس کا سیاسی کلچر کیا ہے؟ کیا یہ سب کچھ ہمارے ملک میں

ہے؟

مغربی جمہوریت کی تین اساسیات ہیں: سیکولرازم، نیشنل ازم، کیپٹل ازم۔ ان تینوں نے ایک دوسرے سے مربوط ہو کر جمہوریت بنائی جو مغربی ملکوں کا نظام ہے۔ سیکولرازم کی ضرورت انھیں اس لیے تھی کہ اس کے بغیر "نیشنل ازم" پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ قوم کے درمیان سے مذہب اور فرقے کے امتیازات کو ہٹا کر (بالخصوص یہودی دشمن کو ختم کر کے) انھیں ایک جان و ایک قالب کیا جا سکتا تھا اور یہ سیکولرازم اور نیشنل ازم مغربی ملکوں کے "کیپٹل ازم" کی ضرورت تھی۔ سرمایہ داری کو اپنے فروغ کے لیے ایسی تہذیب درکار تھی جس میں انسان نفس پرستی کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہو، تکلفات و تعیشات پر زیادہ رقم خرچ کرے تاکہ صنعتوں کو فروغ حاصل ہو اور مجموعی طور پر ملک میں اور دنیا میں اسراف کا کلچر ترقی کرے، اور ضروری اشیا کی پیداوار کے بجائے انسان کی مصنوعی یا ثانوی ضروریات کی صنعتوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے۔ اس لیے کیپٹل ازم کو ایک خاص مادہ پرستانہ تہذیب بھی درکار تھی۔ مغربی جمہوریت نے اس تہذیب کے فروغ کے لیے خاصا کام کیا ہے۔

سرمایہ داری کی ثقافت کی بھی دو شکلیں ہیں: ایک ثقافت تو وہ ہے جو سامراج کے اپنے ملکوں میں فروغ پا چکی ہے اور ایک وہ ہے جو وہ تیسری دنیا میں داخل کر رہا ہے۔ یہ اس مقصد کے تحت ہے کہ قوموں اور ملکوں کا اصل اندرونی وجود خوابیدہ رہے۔ غلامی کے ادوار سے گزرنے کے بعد بھی ان پر ایک مدہوشی کا عالم طاری رہے۔ ان کے قوائے عملیہ معطل رہیں، وہ اپنا بھلا برا نہ پہچان سکیں، ان کے تہذیبی معیارات وہ قرار پائیں جو عالمی سامراج کے سیاسی غلبے اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے لیے مفید ہوں۔ یہ عالمی سامراجی ثقافت زندہ اور انقلابی سپرٹ کا حامل مذہب نہیں چاہتی۔ اسے وہ مذہب چاہیے جو اپنی حقیقی روح سے خالی رسومات و رواجات کا بے جان ڈھانچہ ہو اور سرمایہ داری کی پیدا کردہ تہذیب کے تابع ہو کر رہ سکے۔ اس غرض کے لیے مذہب کے نام پر ہر قسم کے میلوں ٹھیلوں، دھوم دھڑکوں اور بے ہودہ غل غپاڑہ کو زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔ توہم پرستی، شخصیت پرستی، فرقہ پرستی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں عالمی سامراج نے یہ محسوس کیا ہے کہ مسلمان ممالک کے عوام رسمی، رواجی اور بے جان مذہب سے مطمئن نہیں ہیں۔ مذہب کی انقلابیت کو اپنے حالات کی تبدیلی کے لیے بروے کار لانا چاہتے ہیں اور اسلامی انقلابی تحریکوں کی طرف متوجہ ہیں۔ اس بنا پر اس نے اپنے طفیلی حکمران طبقے کے ہاتھ میں بھی اسلام کا جھنڈا دے دیا ہے اور وہ یہ جھنڈا فضا میں لہرا کر اسلام اسلام پکار رہے ہیں۔ اس طرح مسلمان ملکوں میں منافقت کی ثقافت کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے۔

سامراج جب مسلم ملکوں میں داخل ہوا تو اس نے مغرب کی نقالی کا راستہ دکھایا۔ لیکن یہ نقالی کچھ زیادہ

نہیں چل سکی۔ سامراج اپنے ساتھ نیا اقتصادی نظام بھی لایا تھا' اس لیے جوں جوں یہ اقتصادی نظام جڑ پکڑتا گیا' سامراجی ثقافت بھی جڑ پکڑتی گئی۔ آج جو "گلوبل معیشت" ہم پر مسلط ہے' وہ ہماری ثقافت کو یکسر بدل دے گی۔ اس تبدیلی کے لیے اسے وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں۔ اقتصادیات کا پہیہ چاہیے جو اس کی مرضی کے مطابق رواں دواں رہے اور تیزی سے گھومتا رہے۔ اس طرح لوگ بغیر کسی تعلیم و ترغیب کے خود بخود' خود غرض' لالچی' حاسد' لہوولعب کے شوقین' باطنی خوبیوں کے مقابلے میں ظاہری خوبیوں پر جان دینے والے' جذبہ وفا یا مروت سے ناآشنا اور بندہ نفس و بندہ شکم بنتے چلے جائیں گے۔

اس سارے پس منظر میں بنیادی مسئلہ جمہوریت کا نہیں ہے' بلکہ ایسی جمہوریت کو وجود میں لانے کا ہے جو نئے عالمی سامراج کے سیاسی و اقتصادی غلبے کے خلاف جنگ کر سکے۔ جمہوریت لانے سے پہلے ہمیں امریکہ' اس کے عالمی مالیاتی اداروں اور اس کے ثقافتی نمایندوں سے نبٹنا ہوگا۔ ان کو پخنی دینے کا مسئلہ اولین اہمیت کا ہے اور اس جنگ میں اگر ہم فتح پا گئے تو ہم جو جمہوریت تعمیر کریں گے' وہ ہمارے مطلب کی ہوگی' ہمارے تاریخی پس منظر اور اقدار کے مطابق ہوگی اور ہماری معاشی نجات کا بھی سبب ہو سکے گی۔ ورنہ امریکی جمہوریت آئے گی تو یہ ہمارے وجود کے خلاف ایک سازش ہوگی۔ اس سازش سے ہر ایک کو ہوشیار اور خبردار رہنا چاہیے۔

# چند اخوانی ادیب

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی ○

(دوسری قسط)

## محمد قطب

استاذ محمد قطب الاخوان المسلمون کے مفکر و مصنف اور ترجمان سید قطب شہید کے چھوٹے بھائی ہیں۔ پیدائش مصر کے اسی خانوادہ میں ۲۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ہوئی۔ قاہرہ میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد جامعہ قاہرہ میں داخلہ لے لیا جہاں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل کی۔ ۱۹۴۰ء میں ایجوکیشن میں ڈپلوما کیا اور ٹیچرز ٹریننگ کالج سے ایجوکیشن سائیکالوجی کے کورس مکمل کیے۔

استاذ محمد قطب کی زندگی پر ان کے بڑے بھائی سید قطب کے افکار و نظریات اور ان کی قربانیوں کا گہرا اثر پڑا۔ ابتدا ہی سے چھوٹے بھائی کی تعلیم، درسی و غیر درسی مطالعہ کی طرف سید قطب نے خصوصی توجہ صرف کی جس کا اعتراف خود محمد قطب نے کیا ہے:

> سید رحمۃ اللہ کے افکار بالکل آغاز ہی سے میرے ذہن پر حاوی رہے۔ میں نے جب ثانوی تعلیم مکمل کی تو وہ مجھے اپنی سوچ کے دائروں میں شریک کرنے لگے اور مختلف موضوعات پر مباحثہ کے مواقع فراہم کرنے لگے۔ اسی لیے ہماری ارواح اور افکار سب باہم دگر گھل مل گئے۔ پھر ایک ہی خاندان کے تعلق محبت و اخوت نے دو آتشہ کا کام کیا اور باہمی قربت اور ہم آہنگی بڑھتی گئی (محمد المجذوب، علماء و مفکرون عرفتھم، الجزء الثانی، دارالاعتصام قاہرہ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۸)۔

سید قطب سے قربت اور فکری ہم آہنگی کے باوجود آپ کا میدان کار ادب و تصنیف ہی رہا اور اخوان المسلمون سے باقاعدہ تعلق قائم کرنے میں کوئی دل چسپی نہ لی اور نہ اس طرف رجحان ہی گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء میں آپ کو محض اس وجہ سے گرفتار کر لیا گیا کہ آپ قطب خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور اپنی

---

○ ریڈر، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، انڈیا

تحریروں کی وجہ سے عوام میں مقبول اور ہر دلعزیز ہیں اور اپنے مکتبہ سے اسلام پسندوں کی کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ جیل میں محمد قطب اپنے بھائی اور بہنوں کے ساتھ شدید اذیتوں کا نشانہ بنے اور یہیں سے اخوان سے ان کی عقیدت و محبت اور شیفتگی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ آپ ۳۰ جولائی ۱۹۶۵ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء تک جیل میں رہے۔ اس دوران ان کے بڑے بھائی پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے۔ ایک بھانجا ایذا و تعذیب کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔ تین بہنیں گرفتار رہیں جن میں شہید بھانجے کی ماں بھی شامل تھیں۔ سب سے چھوٹی بہن کو ۱۰ برس قید کی سزا دی گئی مگر پورا خاندان اسلام کی راہ میں ثابت قدم رہا اور کسی قسم کی بے صبری اور ادنیٰ گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا۔ محمد قطب کہتے ہیں:

> جن حبی کی آزمائش نے میرے دل پر گہرا اثر کیا کیونکہ یہ میری زندگی کا انوکھا تجربہ تھا۔ جیل کی بدترین سختی اور تشدد نے بعض پہلوؤں سے مجھے بالکل بدل کر رکھ دیا۔ میں پہلے ادب و شعر اور موہوم احساسات کی دنیا میں سانس لیتا تھا۔ میں حیرانی و درماندگی کا شکار رہتا تھا اور یہ صورت حال میرے نفس میں حقیقی بحران کی وجہ بن جایا کرتی تھی جس میں کئی برسوں تک میں غوطہ زن رہا مگر جیل میں داخل ہوتے ہی اولین لمحوں اور اندیشوں نے سارا منظرنامہ بدل کر رکھ دیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی موجود ہوں اور میرا وجود حقیقی ہے اور میرے نفس پر واہمہ نہیں بلکہ حقیقت کی چھاپ ہے۔ یہ حقیقت تھی راہ حق میں مسافت طے کرنے اور دعوت دین کے لیے جدوجہد کرنے کی۔ اور یہ کہ اس راہ کا مسافر ضائع اور برباد نہیں ہوتا بلکہ وہی کامیاب اور راہ یاب ہوتا ہے۔ ان لمحوں نے مجھے چوراہے پر لاکھڑا کیا۔ گم کردہ راہ کی حیرانی ختم ہو گئی اور میں شاہراہ پر گامزن ہو گیا (ایضاً، ص ۲۸۰)۔

استاذ محمد قطب آج کل سعودی عرب میں مقیم ہیں اور ام القریٰ یونی ورسٹی میں ایک مدرس، مصنف اور داعی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ نے اسلام، دعوت اسلامی اور مسلمانان عالم کے موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

○ الانسان بین المادیة والاسلام (انسان مادہ پرستی اور اسلام کے درمیان) ○ منہج الفن الاسلامی (اسلامی فن کی منہاجیات) ○ منہج التربیة الاسلامیة (اسلامی تربیت کی منہاجیات) دو جلدیں ○ معرکة التقالید (تقلید کے خلاف معرکہ آرائی) ○ فی النفس والمجتمع (نفسیات اور معاشرہ کا مطالعہ) ○ التطور والثبات فی الحیاة البشریة (انسانی زندگی میں جمود اور ارتقا) ○ دراسات فی النفس الانسانیة (انسانی نفسیات کا مطالعہ) ○ ھل نحن مسلمون (کیا ہم مسلمان ہیں؟) ○ قبسات من الرسول (رسول اکرمؐ کی تعلیمات کی چند جھلکیاں) ○ شبہات حول الاسلام (اسلام کے خلاف اعتراضات) ○ جاھلیة القرن

العشرین (بیسویں صدی کی جاہلیت) ○ دراسات قرآنیة (قرآنی مطالعات)۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد اشرف علی کا پی ایچ ڈی مقالہ: محمد قطب مساهمته فی النثر العربی الحدیث، غیر مطبوعہ، زیر نگرانی ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۹۵ء)۔

**زینب الغزالی**

اخوان المسلمون کی اہم ادیبہ و مصنفہ اور قید و بند کے مختلف مراحل سے ثابت قدمی کے ساتھ گزرنے والی داعیہ اسلام کی پیدائش ۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو ہوئی۔ والد محترم جامعہ الازہر کے فارغ التحصیل ایک خوشحال تاجر تھے۔ محترمہ زینب نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی اور ثانوی تعلیم کے لیے سرکاری اسکول کا رخ کیا جہاں سے علم، حدیث، تفسیر اور دعوۃ میں سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔ والد نے ایک داعی اور معلم کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی اور جنگ احد میں شریک صحابیہ حضرت نسیبہؓ بنت کعب المازنیہ کے اسوہ کو ہمیشہ سامنے رکھنے کی تلقین کی۔ نوجوانی میں ہدیٰ شعراوی[1] کی تحریک نسواں میں شمولیت اختیار کی مگر جلد ہی یہ حقیقت سمجھ میں آگئی کہ یہ تحریک آزادی اور حقوق کے نام پر خواتین کو گمراہ کر رہی ہے اور یہ کہ اسلام نے عورتوں کو تمام حقوق فراہم کیے ہیں، اس لیے کسی اور نظریہ اور نظام کے در پر دستک دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ۱۸ برس کی عمر میں ۱۹۳۶ء میں آپ نے جماعة السیدات المسلمات کی بنیاد رکھی اور مسلم خواتین و طالبات کو اسلام کے لیے جدوجہد کرنے پر ابھارا۔ حکومت نے اس تنظیم کی مقبولیت اور توسیع کو دیکھ کر ۱۹۶۴ء میں اس پر پابندی لگا دی۔ اس وقت اس کے ارکان کی تعداد ۳۰ لاکھ تھی۔ مصر کی معروف مسجد جامع ابن طولون میں آپ نے اسلامی موضوعات پر مواعظ و خطبات کا ہفتہ وار سلسلہ شروع کیا تو ابتدا میں ۳ ہزار خواتین جمع ہوئیں اور پھر یہ تعداد بڑھ کر ۵ ہزار تک پہنچ گئی۔

(The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World, Vol. II, p 64. (Oxford University Press, 1995).

جماعة السیدات المسلمات نے خطبات و دروس اور لیکچرز کا انصرام کرنے کے ساتھ ایک جریدہ بھی شائع کیا۔ ایک یتیم خانہ بھی قائم کیا اور ناداروں کو مالی امداد فراہم کی اور خاندانی تنازعات کے تصفیے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ سیاسی محاذ پر خواتین کو ملک میں نفاذ قرآن و سنت کے مطالبہ کے لیے منظم کیا۔

اخوان المسلمون کے بانی رہنما شیخ حسن البنا نے محترمہ زینب الغزالی سے درخواست کی کہ مقصد کی وحدت اور فکر و نظر میں ہم آہنگی کے پیش نظر جماعة السیدات المسلمات اور اخوان کی خواتین شاخ الاخوات المسلمات میں انضمام عمل میں آ جائے، مگر اس تجویز کو مختلف اسباب کی وجہ سے عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ ۱۹۴۹ء میں شیخ البنا کی شہادت سے کچھ قبل باہمی مفاہمت کی یہ راہ نکلی کہ زینب الغزالی نے امام

شہید کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اپنی تنظیم کے سلسلے میں ہر قسم کے فیصلے کا اختیار مرشد کے حوالے کر دیا۔ مختلف مصالح کے پیش نظر مرشد عام نے جماعۃ السیدات المسلمات کو آزادانہ کام کرتے رہنے کا مشورہ دیا اور زینب الغزالی کو اپنی بیعت میں شامل کر لیا۔ ۱۹۵۰ء میں ناصر کے دور استبداد میں اس تنظیم نے الاخوات المسلمات کے شانہ بشانہ کام کیا اور جیلوں میں بند اخوانی کارکنوں کے اہل خاندان کی کفالت اور پرورش میں ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۶۵ء میں محترمہ زینب الغزالی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور فوجی عدالت نے آپ کو ۲۵ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ صدر انور السادات کے دور حکومت میں ۱۹۷۱ء میں آپ کو جیل سے رہائی نصیب ہوئی اور اس طرح سزا میں تخفیف ہو گئی مگر قید وبند کے ان ایام میں آپ کو بڑے روح فرسا اور لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بنایا گیا جس کی کچھ جھلک آپ کی خودنوشت ایام من حیاتی (میری زندگی کے چند روز) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوئی۔ خود فاضل مصنفہ نے بیان کیا ہے کہ ایذا و تعذیب کے یہ جاں گداز مرحلے بیشتر مردوں کی قوت برداشت سے باہر تھے اور اگر معجزات اور بصیرت خداوندی سے ہم آغوش نہ ہوتیں تو وہ اس کڑی آزمایش میں ثابت قدم نہ رہ سکتی تھیں (زینب الغزالی ایام من حیاتی، بیروت، دارالقرآن الکریم للعنایۃ بطبعہ و نشر علومہ، ص ۷۰-۱۷۱)۔ دراصل جمال عبدالناصر نے انھیں اور ان کے رفیق عبدالفتاح اسماعیل کو خصوصی ہدف بنا رکھا تھا کیونکہ ناصر یہ سمجھتا تھا کہ نوجوانوں کو بھڑکانے والے یہی لوگ ہیں۔ زینب الغزالی یہ سمجھتی ہیں کہ جب تک امریکہ اور روس کا زوال نہیں ہوتا، اسلام قائم نہیں ہو سکتا (ایضاً، ص ۱۵۱)۔ انھوں نے اس پروپیگنڈے پر بھرپور تنقید کی کہ ناصر کے قتل کی سازش میں اخوانیوں کا ہاتھ تھا۔ ان کے خیال میں نااہل حکمرانوں کے قتل سے اس معاشرے کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا جو اسلامی تعلیم و تربیت کا سخت حاجت مند ہے۔ بنیادی مسئلہ اسلام کے اخلاقی نظام کی ترویج و تنفیذ کا ہے (ایضاً، ص ۱۸۴)۔

محترمہ زینب الغزالی پابند سلاسل ہوئیں تو حکومت نے ان کی تنظیم کو اسی نام کی ایک دوسری تنظیم میں ضم کر دیا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ نے اخوان کے ترجمان الدعوۃ میں اسلامی موضوعات پر پھر قلم اٹھایا۔ ستمبر ۱۹۸۱ء میں صدر سادات نے اس پر پابندی لگا دی تو ایک دوسرے رسالہ لواء الاسلام کے ذریعے قلمی جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ اپنے آپ کو الاخوات المسلمات کی ماں سمجھتی ہیں اور دعوت اسلامی کے مقاصد کے لیے اپنے آپ کو یکسو اور وقف کر رکھا ہے۔

اسلام، دعوت اسلامی، اسلامی حکومت کے قیام اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں ان کا ذہن بالکل صاف اور یکسو ہے۔ وہ کتاب و سنت کی بنیاد پر اسلامی معاشرے کی تعمیر سے پہلے کسی قسم کی انقلابی جدوجہد کو سعی لاحاصل تصور کرتی ہیں خواہ اس کے لیے طویل جدوجہد کرنی پڑے۔ کہتی ہیں:

جی ہاں' ہمیں کوئی عجلت نہیں ہے۔ سال' دہائیاں اور صدیاں دعوتوں اور تحریکوں کی عمر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ہم راستے پر ثابت قدم رہیں اور اپنے طریق کار کی صحت اور نقطۂ نظر کی درستی پر ہمارا اعتقاد محکم ہو (ص ۹)۔

ہمیں یقین ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ ہمیں اطمینان ہے کہ ہم ایمان و اسلام کی تعمیر میں کچھ نئی اینٹیں لگا رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم تھڑدلی کا شکار نہ ہوں' پست ہمت اور بودے نہ بنیں اور اپنے عقیدے سے دست بردار نہ ہوں--- عقیدہ توحید کا' عمل کا' تمام انسانوں کے سامنے حق کو بیان کرنے کا عقیدہ' ایمان اس بات پر کہ قیدوبند اور تعذیب کا یہ مرحلہ تاریخ کا تسلسل ہے۔ اس سبق کو راہ حق کے ہر مسافر کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ وہ جہاد کی راہ پر گامزن رہے اور داعیان دین کا معاملہ کلامی مباحث' لذت اندوزی کی گفتگو اور تاریخ کی داستان تک محدود نہ رہ جائے (ص ۱۰)۔

۱۹۶۵ء میں جب جماعۃ السیدات المسلمات کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو ارکان خواتین نے جو احتجاجی قرارداد منظور کی اس سے بھی محترمہ زینب الغزالی اور ان کی ہم خیال خواتین کی اسلامی جرات و موقف کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرارداد کے چند جملے یہ تھے:

ہم مسلمان خواتین حکومت کے اس فیصلے کو مسترد کرتی ہیں۔ صدر جمہوریہ جو حکومت کے سیکولرازم کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے' ہم پر دھونس نہیں چلاسکتا' نہ وزارت شئون اجتماعیہ ہم پر اپنا فیصلہ نافذ کرسکتی ہے۔ دعوت اسلامی کسی جایداد یا بینک بیلنس کا نام نہیں ہے کہ اللہ و رسول اور امت مسلمہ کے دشمن اور ان کی حکومت اسے ضبط کرلے اور اس کا کام تمام کردے۔

حکومت تمام رقوم اور جایداد ضبط کرلے مگر ہمارا عقیدہ ہم سے نہیں چھین سکتی۔ ہمارا مشن دعوت اور داعیان کرام کا مشن ہے۔ ہم کلمہ توحید کی چھتری تلے کھڑے ہیں۔ خدا کی وحدانیت پر اعتقاد ہمیں مسلسل غیر منقطع جہاد کا پابند بناتا ہے تاآنکہ دین کا فہم و شعور رکھنے والوں کے ذریعے اسلام کی حکومت قائم ہو جائے (ص ۲۳-۲۴)۔

### شیخ محمد الغزالی

شیخ محمد الغزالی (۱۹۱۷ء - ۱۹۹۶ء) مصر کے ایک ممتاز مذہبی عالم' داعی اور مفکر ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء میں بحیرہ کے ایک گاؤں "نکلاالعنت" میں پیدا ہوئے۔ بعد میں والد نے نقل مکانی کرکے اسکندریہ میں سکونت اختیار کرلی۔ والد تجارت کا پیشہ کرتے تھے۔ انھوں نے بیٹے کو ابتدا ہی میں حفظ قرآن پر لگا دیا۔ والد شیخ الاسلام امام ابوحامد الغزالیؒ کے معتقد اور مداح تھے۔ تصوف اور ارباب تصوف سے بے پناہ عقیدت و ارادت رکھتے تھے۔ اپنے بیٹے کا نام محمد الغزالی دراصل ایک خواب کے نتیجے میں رکھا جس میں امام غزالیؒ نے انھیں کچھ

اشارے کیے تھے۔ لیکن شیخ محمد الغزالیؒ نے آگے چل کر علم و تحقیق میں جو مسلک اختیار کیا وہ امام غزالیؒ صاحب تہافت الفلاسفہ' اور علامہ ابن رشد صاحب تہافت التہافت کے نظریات و منہاجیات کا جامع مسلک تھا۔ اگر امام غزالیؒ ایک فلسفی کا دماغ رکھتے تھے اور امام ابن تیمیہؒ نے ایک فقیہ کا تفقہ پایا تھا تو شیخ غزالی فلسفہ و فقہ' دونوں میدانوں کے شاگرد اور شناور تھے (قطب عبدالحمید قطب' خطب الشیخ محمد الغزالی فی شئون الدین والحیاۃ' دارالاعتصام' قاہرہ' ۱۹۸۷ء' الجزالاول' ص ۱۳)۔

محمد الغزالی نے ۱۹۴۱ء میں جامعہ الازہر سے فراغت حاصل کی اور اپنے ملک اور دوسرے عرب ملکوں میں متعدد اہم مناصب پر فائز رہے۔ مصر میں مساجد کونسل کے ڈائرکٹر' اسلامی دعوۃ کے ڈائرکٹر جنرل اور وزارت اوقاف میں انڈر سیکرٹری کی حیثیت میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جامعہ الازہر' جامعہ الملک عبدالعزیز ریاض اور جامعہ ام القریٰ مکہ نیز قطر یونی ورسٹی میں آپ نے مختلف مرحلوں میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ امیر عبدالقادر اسلامک یونی ورسٹی الجزائر کے اکیڈمک ڈائرکٹر بھی آپ رہے۔

دسمبر ۱۹۵۳ء میں اخوان المسلمون کی ہیئت تاسیسی سے آپ کو معطل کر دیا گیا تھا کیونکہ دوسرے مرشد عام حسن اسماعیل الہضیبیؒ کے خلاف تحریک عدم اعتماد چلانے والوں میں آپ کو بھی ملوث پایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جمال عبدالناصر کی شہ پر یہ تحریک چلی تھی جس کا شکار شیخ محمد الغزالی بھی بن گئے۔ بہرحال اخوان سے اخراج کے بعد بھی تادم حیات اسی فکر اور نظریہ کو سینے سے لگائے دین کی دعوت و اشاعت میں مصروف رہے۔

آپ کی زندگی پر جن اساتذہ و مصنفین کا گہرا اثر پڑا ان میں مندرجہ ذیل بڑے اہم ہیں:

۱- شیخ عبدالعظیم الزرقانی' مصنف مناھل العرفان فی علوم القرآن' یہ کلیہ اصول الدین جامعہ ازہر میں استاد تھے۔ ۲- معہد الاسکندریہ الدینی کے اساتذہ شیخ ابراہیم الغرباوی اور شیخ عبدالعزیز بلال' جو تقویٰ و طہارت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ ۳- شیخ محمود شلتوت' جو بعد میں جامعہ ازہر کے شیخ مقرر ہوئے۔ ۴- شیخ حسن البناؒ۔

آخر الذکر کا اثر سب سے زیادہ گہرا پڑا۔ شیخ محمد الغزالی خود لکھتے ہیں:

> امام شہید سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ وہ عقیدہ و شریعت کے عام علما سے زیادہ تفقہ رکھنے والے عالم دین تھے۔ وہ ایک قادر الکلام اور فصیح اللسان خطیب تھے۔ الفاظ ان کے منہ سے ابلتے تھے۔ وہ ہمیشہ اصولی گفتگو کرتے تھے۔ فضول بحثوں سے اجتناب کرتے تھے۔ حقائق کو پیش نظر رکھتے تھے' اوہام و تصورات کے پیچھے بھاگنے کے قائل نہ تھے۔ حسن البنا کو اس خوفناک مرحلے کا پورا ادراک تھا جس سے سقوط خلافت اور انہدام مملکت کے بعد اسلام گزر رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ

مشرقی و مغربی سامراج اسلامی حکومت کے ترکہ کو باہم تقسیم کر چکے تھے۔ اس مرد مومن نے خوفناک اور تہلکہ خیز طوفان کے آگے بند باندھ دیا (ایضاً، ص ۱۴)۔

شیخ محمد الغزالی نے جس مکتبہ فکر کو رائج کیا اس کی بنیاد اسلامی تاریخ کے تمام فقہی مسالک اور فکری رجحانات سے استفادہ پر قائم تھی۔ وہ نفسیات، معاشرت، سیاسیات، اقتصادیات اور تاریخ کے جملہ علوم عمرانی و انسانی کے تجربات و افکار اور دریافت کردہ نظریات سے اخذ و استفادہ کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ اسی سے کتاب و سنت کے صحت مند تفقہ کی آمیزش سے اجتہادی راہ پر گامزن ہونا ممکن ہے۔ وہ کہتے تھے کہ:

احکام شریعت کے تئیں صحت مند نقطۂ نظریا درست فیصلہ اسی وقت ممکن ہو گا جبکہ فہم و تفقہ کا افق کشادہ ہو اور قدیم و جدید علوم سے یکساں واقفیت کا عظیم الشان پس منظر موجود ہو۔ ہمارے اسلاف کا حال تو یہ تھا کہ انھیں فطرت کی سلامتی اور ذہانت و ذکاوت کا ایسا وافر حصہ عطا ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ فہم و فیصلہ کی قدرت کے پورے طور پر مالک تھے مگر آج اس دور میں ہم ان کا معیار اسی صورت میں باقی رکھ سکتے ہیں جب کہ کئی گنا زیادہ مطالعہ کریں جس طرح دھندلی نظر کا آدمی خصوصی عینک کا استعمال کرتا ہے تاکہ وہ پڑھ سکے یا دور سے ان چیزوں کو دیکھ سکے جنھیں وہ عریاں آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا (ایضاً، ص ۱۵)۔

شیخ محمد الغزالی نے دعوت و جہاد کے میدان میں ۴۰ برس گزارے۔ مختلف مرحلوں اور نازک مقامات سے گزرنے کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ آج دین کی دعوت و تبلیغ کا کام بڑی تنظیم، منصوبہ بندی اور حکمت کا متقاضی ہے۔ داعی دین کو کتاب و سنت، فقہ اسلامی اور تہذیب اسلامی سے بھرپور واقفیت رکھنے کے ساتھ انسانی تاریخ، علوم کائنات و حیات اور معاصر انسانی ثقافتوں، تہذیبوں، فلسفوں اور نظریات کا بھی شناور ہونا چاہیے۔ اس کے دل و دماغ کے دریچے ہمیشہ وا رہیں تاکہ ان میں تازہ ہوا داخل ہو سکے۔ وہ انانیت، عجلت پسندی، اشتعال اور جذبات کا صید زبوں نہ ہو۔ دشمنان دین کے طور طریقوں اور اسالیب و منہاجیات سے پوری طرح آگاہ ہو۔ شیخ کے نزدیک دعوت و تبلیغ کے میدان میں سب سے زیادہ ضرر رساں اور مہلک چیز فاسد دین داری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دعوت اسلامی کے میدان میں ۴۰ برس کام کرنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلامی کاز کو سب سے زیادہ نقصان فاسد دین داری نے پہنچایا ہے یعنی نفس ایسی غیبی طاقت کی طرف مائل ہو جس سے غلط اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو یا اوہام و خرافات کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ مثال کے طور پر دین عقلی بیداری کا پیامبر ہے اور یہ لوگ عقل و ذہن کو خواب آور خوراک فراہم کرتے ہیں۔ دین قلب سلیم کا تقاضا کرتا ہے اور ان لوگوں کے دلوں پر بیمار ذہنیت کا تسلط ہے۔

اس فاسد دین داری کی نقاب کشائی کے لیے تفصیل درکار ہے تاکہ ان تمام نفسی و عقلی آفات اور بیماریوں کا تذکرہ ہو سکے جو اس معصیت کا سبب بنتی ہیں۔ امام ابوحامد الغزالی نے احیا علوم الدین میں ان آفات اور امراض سے تفصیلی تعرض کے لیے ایک ضخیم حصہ مخصوص کیا ہے۔ اسی طرح امام ابن الجوزی نے اپنی تصنیف تلبیس ابلیس میں اس فاسد دین داری کی مختلف صورتوں سے پردہ اٹھایا ہے اور عوام و خواص کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی ہے (ایضاً، ص ۱۷)۔

شیخ محمد الغزالی نے کم و بیش ۴۰ کتابیں تصنیف کیں۔ چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

○ تاملات فی الدین والحیاۃ (دین اور زندگی کے چند مسائل پر غور و فکر) ○ لیس من الاسلام (اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے) ○ رکائز الایمان بین العقل والقلب (عقل و قلب کے درمیان ایمانی ذخیرے) ○ الدعوۃ الاسلامیۃ تستقبل القرن الخامس عشر (دعوت اسلامی پندرہویں صدی کے استقبال میں) ○ عقیدۃ المسلم ○ خلق المسلم (مسلم کا اخلاق) ○ مشکلات فی طریق الحیاۃ الاسلامیۃ (اسلامی زندگی کے مسائل) ○ کیف نتعامل مع القرآن (ہم قرآن سے کیسا برتاؤ کریں؟) ○ الاسلام المفتری علیہ بین الشیوعیین والراسمالیین (اسلام، کیمونسٹوں اور سرمایہ داروں کے اعتراضات کے گھیرے میں) ○ الاسلام والاستبداد السیاسی (اسلام اور سیاسی استبداد) ○ الاسلام والاوضاع الاقتصادیۃ (اسلام کا اقتصادی نظام) ○ الاسلام والطاقات المعطلۃ (اسلام اور معطل قوتیں) ○ الاسلام والمناھج الاشتراکیۃ (اسلام اور اشتراکیت) ○ التعصب والتسامح بین المسیحیۃ والاسلام (اسلام اور مسیحیت میں تعصب اور رواداری) ○ جدد حیاتک (اپنی زندگی کو تازہ رکھو) ○ حقیقۃ القومیۃ العربیۃ (عرب قومیت کی حقیقت) ○ دفاع عن العقیدہ والشریعۃ (مستشرقین کے جواب میں اسلامی عقائد کا دفاع) ○ فقہ السیرۃ (تفہیم سیرت) ○ قذائف الحق (حق پر اعتراضات) ○ کیف نفھم الاسلام (اسلام کی تفہیم) ○ مع اللہ۔ دراسات فی الدعوۃ والدعاۃ (داعی اور دعوت پر چند مطالعے) ○ نظرات فی القرآن (قرآن پر تدبر کے چند شذرات) ○ فی معرکب الدعوۃ (کاروان دعوت کے جلو میں)۔

شیخ محمد الغزالی کی ایک اہم تصنیف من ھنا نعلم (یہاں سے ہمیں علم حاصل ہوتا ہے) ہے جو دراصل شیخ خالد محمد خالد [۴] کی تصنیف من ھنا نبدا (ہم یہاں سے آغاز کرتے ہیں) کا بھرپور جواب ہے۔ خالد نے اس کتاب میں تہذیبی و ثقافتی گمراہی کا راستہ دکھایا تھا اور اسلام کے نام پر غیراسلامی فکر کی ترویج کی تھی۔ گرچہ شیخ خالد نے اس فکر سے رجوع کرلیا اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں الدولۃ فی الاسلام لکھ کر کفارہ ادا کردیا مگر قتل کے بعد جفا سے توبہ کرنے کا نتیجہ پشیمانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ ان کی کتاب

سے پوری ایک نسل اسلامی تہذیب سے برگشتہ ہوئی اور مختلف شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنس کر رہ گئی۔ چنانچہ شیخ الغزالی نے اس کتاب کے مباحث کی مغالطہ آمیزی اور مصنف کی کج فکری کا سخت اور سنجیدہ نوٹس لیا اور علمی استدلال کے ذریعے اس کتاب کے پیدا کردہ تمام اعتراضات و شکوک کے کانٹے ایک ایک کر کے نکال دیے۔ چنانچہ اس پہلو پر اسلامی تصور آج مسلمات میں شمار ہونے لگا ہے (عمر عبید حسنہ، تقدیم، مشکلات فی طریق الحیاة الاسلامیة لمحمد الغزالی، کتاب الامہ، قطر، ۱۴۰۲ھ، ص ۱۲)۔ اسی طرح فاضل مصنف کی ایک اور کتاب دستور الوحدة الثقافیة بین المسلمین بڑی اہم ہے۔ مصنف کی یہ بحث بڑی جان دار ہے کہ اگر مسلمانوں میں فکری وحدت موجود ہے تو گویا ہر مسئلے کو حل کیا جا سکتا اور ہر بیماری دور کی جا سکتی ہے اور اگر یہ فکری وحدت ختم ہو جائے تو اس کی تلافی ممکن نہیں ہے اور آج یہی صورت درپیش ہے۔ عالم اسلام تہذیبی پسماندگی اور ثقافتی درماندگی میں مبتلا ہے۔ یہی وہ مرکزی فکر تھی جسے پوری شدت و قوت سے الجزائری مفکر مالک بن نبی [۳] نے پیش کیا تھا (عمر عبید حسنہ، حوالہ بالا، ص ۱۳)۔

### مصطفی السباعی

شام کے مفکر، مصنف اور بانی تحریک اسلامی شیخ مصطفی السباعی (۱۹۱۵ء-۱۹۶۴ء) علما کے خانوادے میں شہر حمص میں پیدا ہوئے۔ والدین نے دینی تربیت و تعلیم کے ساتھ سیاسی شعور اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس بھی بیدار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر موصوف نے فرانسیسی استعمار کے خلاف عملی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۸ برس کی عمر میں شیخ نے مصر کا سفر کیا اور یہ سفر ان کی زندگی کے لیے راہ عمل اور نقشہ کار متعین کرنے میں بڑا کارگر ثابت ہوا۔ جامعہ الازہر میں داخلہ لے کر آپ نے مصر کی اسلامی و سیاسی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ یہیں آپ شیخ حسن البنا سے بیعت ہوئے اور اخوان المسلمون میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۳۴ء میں برطانوی استعمار کے خلاف احتجاجی مظاہروں کو منظم کرنے کے جرم میں جیل میں ڈال دیے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں انگریزوں نے دوبارہ گرفتار کر لیا اور تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں آپ کو فلسطین کے سرفند کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں رہائی ملی تو حمص آکر انجمن شباب محمد کی بنیاد ڈالی۔ جلد ہی فرانسیسی استعمار نے مختلف سماجی اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے ڈھائی سال کے لیے جیل میں بند کر دیا۔ قید و بند کی یہ مدت ذہنی و جسمانی تعذیب و ایذا دہی کی وجہ سے شیخ کی صحت کے لیے بڑی مہلک ثابت ہوئی مگر ۱۹۴۳ء میں دیوار زنداں سے باہر آئے تو اگلے ۲۰ برسوں میں وہ ایک مجاہد، مصنف، معلم اور قائد تحریک کی حیثیت میں شامی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن اور اعدائے اسلام کے لیے برہنہ تلوار ثابت ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں شیخ مصطفیٰ السباعی نے مختلف اسلامی جمعیتوں کو اتحاد و انضمام کی دعوت دی اور سب نے مل کر شام میں الاخوان المسلمون کی تشکیل کی۔ شیخ السباعی اس کے پہلے مراقب عام منتخب ہوئے۔ آپ نے تحریک کے استحکام کے لیے سخت مجاہدہ کیا۔ اسے سیاسی پارٹی کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک روحانی و اخلاقی اجتماعیت کی حیثیت میں ملک میں ہمہ گیر اسلامی اصلاح و تبدیلی کے لیے رائے عامہ کی ہمواری کے لیے منظم کیا۔ چونکہ دمشق یونی ورسٹی میں آپ ایک معلم اور منتظم کی حیثیت میں فائز تھے، اس لیے نئی نسل کی تربیت کے بہتر مواقع آپ کو میسر آئے۔

شیخ مصطفیٰ السباعی کی اہم تصنیف اشتراکیۃ الاسلام نے کافی ہنگامہ کھڑا کیا۔ مصنف نے دعویٰ کیا کہ مغرب کے مادہ پرستانہ الحادی نظریہ کے علی الرغم اسلام کا تصور اشتراکیت بالکل مختلف اور متضاد ہے۔ اس تصور کی بنیاد انسانی فطرت پر ہے اور یہ زندگی، آزادی، علم، وقار اور ملکیت کے پانچ فطری حقوق پر استوار ہے۔ اللہ اس کائنات کا مالک و متصرف ہے۔ انسان محنت و دیانت کے ذریعے املاک و جایداد کے مناسب استعمال پر مامور ہے۔ بنیادی عوامی خدمات کی تعمیم (عمومیت) اور تکافل اجتماعی اور مباعیت (باہم رضامندی) کی بنیاد پر اسلامی قوانین کی تنفیذ کر کے ریاست ایک طرح سے تنظیم کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ شیخ السباعی کے ان نظریات پر بڑی تنقیدیں ہوئیں کیونکہ یہ ایک طرح سے اسلام اور سوشلزم کا ملغوبہ تیار کیا گیا تھا۔

(The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World, Vol.IV, pp 71-72)۔

خرابی صحت کی بنا پر ۱۹۵۷ء میں السباعی نے عصام العطار کو اپنا جانشین مقرر کر دیا، گرچہ روحانی طور پر اپنی وفات تک وہ قیادت کرتے رہے۔ مذکورہ بالا تصنیف کے علاوہ کچھ دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱- السیرۃ النبویۃ - دروس وعبر (سیرت نبویؐ - عبرت و نصیحت کا خزینہ) ۲- من روائع حضارتنا (ہماری تہذیب کے تابناک پہلو) ۳- المراۃ بین الفقہ والقانون (عورت اسلامی فقہ اور جدید قوانین کے تناظر میں) ۴- ھکذا علمتنی الحیاۃ (خود نوشت)۔

آپ نے تین معروف ادبی اور علمی جرائد کی ترتیب و ادارت کے فرائض بھی انجام دیے: ۱- المنار ۲- المسلمون ۳- حضارۃ الاسلام۔

آپ نے فقہ اسلامی کی ایک انسائیکلوپیڈیا کی جمع و ترتیب کا آغاز کر دیا تھا مگر کام مکمل نہ ہو سکا۔

(جاری)

---

حواشی

(۱) ہدیٰ شعراوی (۱۸۷۹ء - ۱۹۴۷ء) مصری تحریک نسواں کی ایک اہم رہنما، بالائے مصر کے علاقے المنیا میں پیدا ہوئیں۔

پورا نام نورالہدیٰ سلطان تھا مگر ہدیٰ شعراوی کے نام سے معروف ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت قاہرہ ہی میں ہوئی۔ حفظ قرآن کے ساتھ فرانسیسی زبان میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ ۱۳ برس کی عمر میں چچازاد علی شعراوی سے شادی کی۔ ایک سال کے بعد ہی سات سال کے لیے شوہر سے علیحدگی ہوگئی۔ اس دوران ایک خواتین سیلون میں کام کیا جہاں سے وہ تحریک نسواں سے متعارف ہوئیں۔ ۱۹۰۰ء میں شوہر کے ساتھ دوبارہ رہنے لگیں۔ چنانچہ دو بچوں ایک بیٹی بثنہ اور بیٹے محمد کی ماں بنیں۔ ۱۹۰۹ء میں قاہرہ یونی ورسٹی اور الجریدہ کے دفاتر میں پہلی بار خواتین کے لیے خواتین کے ذریعہ لیکچرز کا اہتمام کیا۔ ۱۹۱۴ء میں خواتین کے اندر مغربی بیداری پیدا کرنے کے لیے الاتحاد النسائی التہذیبی کی بنیاد رکھی اور اسی مقصد کے لیے ایک دوسری انجمن جمعیۃ الرقی الادبیۃ للسیدات المصریۃ (مصری خواتین انجمن برائے ادبی ترقی) کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ ان تنظیموں کا مقصد ادب و ثقافت کے خوشنما نعروں کے ذریعے مصری خواتین کو اسلام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا تھا۔ میاں اور بیوی نے مل کر اس فتنہ کو خوب ہوا دی۔ ۱۹۱۹ء میں خواتین کی ایک احتجاجی ریلی منظم کرنے کے بعد وفد پارٹی کی خواتین شاخ (لجنۃ الوفد المرکزیۃ للسیدات) کی مرکزی صدر مقرر کر دی گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے قومی جنگ آزادی میں خواتین کی پرتشدد شرکت کے لیے راہ ہموار کی اور انگریزوں کے تجارتی سامانوں کی خرید و استعمال کے خلاف منظم تحریک چلائی۔

۱۹۲۳ء میں آزادی کے حصول کے بعد شعراوی نے الاتحاد النسائی المصری کی تاسیس کی اور اس کی صدر مقرر ہو کر مصر میں پہلی "تحریک نسواں" کی بھرپور قیادت کی۔ اسی سال روم کی ایک بین الاقوامی خواتین کانفرنس میں شرکت کے بعد وطن واپس آئیں تو ایک سیاسی مظاہرے میں شرکت کرتے ہوئے عوام کے سامنے پہلی بار چہرے کا حجاب نوچ کر پھینک دیا اور پھر بے حجابی ان کا شعار بن گئی۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے خواتین کے مفت علاج کے لیے دارالتعاون الاصلاحی کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۹۲۵ء میں فرانسیسی زبان میں ایک ماہوار رسالہ "L'Egyptienne" جاری کیا۔ ۱۹۳۷ء میں عربی زبان میں ماہنامہ المصریۃ کا بھی آغاز ہوگیا۔ ان دونوں رسالوں نے تحریک نسواں کے افکار و نظریات کی خوب اشاعت کی اور اسلام کے روایتی تصورات پر حملے کیے۔ ۱۹۳۸ء میں ہدیٰ شعراوی کو خواتین کانفرنس برائے دفاع فلسطین کی میزبانی اور ۱۹۴۴ء میں قاہرہ میں Arab Feminist Conference کا اہتمام و انصرام کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں الاتحاد النسائی العربی کی تشکیل ہوئی تو اس کی اولین صدر منتخب ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء میں وفات سے کچھ قبل ہی حکومت مصر نے انھیں اعلیٰ ترین امتیاز سے نوازا۔

(۲) خالد محمد خالد مصر کے معروف و متنازع مصنف اور مقالہ نگار ۱۹۲۰ء میں صوبہ شرقیہ میں پیدا ہوئے۔ کلیۃ الشریعۃ جامعۃ الازہر سے ۱۹۴۷ء میں گریجوایشن کیا اور اس کے بعد وہیں سے فن تدریس میں سرٹیفکیٹ کا کورس بھی مکمل کیا۔ عربی زبان کے ایک استاذ کی حیثیت سے انھوں نے ملازمت شروع کی۔ اس کے بعد وزارت تعلیم کے ادارۃ الثقافۃ میں اور وزارت ثقافت کی ہیئت الکتب کے ساتھ بھی مدتوں منسلک رہے۔ بعد میں شعبہ اشراف علی ادارۃ تحقیق التراث کے

سپروائزر بھی مقرر ہوئے۔ ۳۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ مختلف علمی' ادبی اور سیاسی موضوعات پر قلم اٹھایا اور الشرق الاوسط لندن' المسلمون' المصور' الاہرام اور الوفد جیسے اخبارات و جرائد میں آپ کے افکار شائع ہوتے رہے۔ آپ کی پہلی تصنیف من هنا نبدا ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تو علما ازہر کے سخت احتجاج کی وجہ سے حکومت نے اسے ضبط کرلیا۔ پھر قاہرہ ڈسٹرکٹ کورٹ کے حکم سے یہ ضبطی منسوخ ہوئی۔ اس کتاب میں دین اور ریاست کی تفریق کی وکالت کی گئی تھی اور ۱۹۲۰ء میں علی عبدالرزاق کی طبع شدہ کتاب الاسلام واصول الحکم کے افکار کی حمایت کی گئی تھی۔ مصنف نے معتدل جمہوری سوشلزم' موثر برتھ کنٹرول اور حقوق نسواں کا مطالبہ کیا تھا۔ ان افکار کا اظہار مصنف نے اپنی دوسری کتب جیسے مواطنون لارعایا (۱۹۵۱ء) اور معا علی الطریق محمد والمسیح (۱۹۵۸ء) میں بھی کیا۔ اسی طرح اپنی ایک اور تصنیف الدیمقراطیة ابدا (۱۹۵۳ء) میں بھی یہی نظریہ پیش کیا۔ ۱۹۸۱ء میں اپنی نئی کتاب الدولة فی الاسلام میں مصنف نے اپنے سیکولر نظریہ سے توبہ کی اور اسلام کے مذہبی و شہری مشن کی تنفیذ کے لیے حکومت کی ضرورت محسوس کی۔ اسلامی حکومت میں آزادی کے تصور پر انھوں نے زور دیا اور شورائی نظام کو پارلیمانی جمہوریت کے مشابہ قرار دیا۔

(۳) مالک بن نبی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۳ء) الجزائر کے بہت بڑے اسلامی مفکر تھے۔ آپ کی پیدائش کے وقت ملک پر فرانسیسیوں کا تسلط تھا۔ انھوں نے ملک کی تہذیب' تمدن اور تشخص کو مسخ کرنے کے لیے عسکری' سیاسی' علمی محاذوں پر جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے شیخ عبدالحمید بن بادیس نے ۱۹۱۳ء میں جمعیتہ العلما المسلمین کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں مالک بن نبی نے الیکٹرک انجینیرنگ کی تحصیل کے لیے پیرس کا سفر کیا تو وہ ایک مستغرب طالب علم تھے۔ مغرب کا مطالعہ انھوں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے کیا۔ وہاں مسلمانوں کی تمام تحریکوں سے انھیں آشنائی ہوئی۔ امیر شکیب ارسلان اور گاندھی سے ملاقات کی۔ ۱۹۵۲ء میں انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں الجزائر واپس آئے تو ہائر ایجوکیشن کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے مگر تحریک اور فکری کام سے دست کش نہ ہوئے۔ کچھ سالوں تک قاہرہ میں بھی مقیم رہے۔ آخری سالوں میں فرانسیسی کے علاوہ عربی میں بھی براہ راست لکھنے لگے تھے۔ وفات وطن ہی میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں پہلی فرانسیسی تصنیف الظاهرة القرآنية منظر عام پر آئی جس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں عربی میں ناول لبیک شائع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں فرانسیسی میں The Conditions of Renaissance' ۱۹۵۴ء میں فرانسیسی میں اور ۱۹۸۸ء میں انگریزی میں Islam in History and Society شائع ہوئی۔ دو جلدوں میں مذکرات شاهد القرن دل چسپ خود نوشت ہے۔ دوسری کتب یہ ہیں:

In the Whirl Wind World of the Battle (1961), The Agro-Asiatism (1956), The Ideological Struggle in the Colonized Countries (Arabic, 1957), The New Social Edification (Arabic, 1958), The Idea of an Islamic Common Wealth (Arabic, 1958) etc.

ہم ہر نماز میں 'سیدھی صف میں 'سیدھے کھڑے ہو کر' بارگاہ الٰہی میں صراط مستقیم پر چلنے کی دعا کرتے ہیں۔

سیدھے راستے پر چلنے کے لیے :

اپنے کاموں کو سیدھا رکھنا اور زندگی کو سیدھا رکھنا ناگزیر ہے ـــ

سوچ کا سیدھا ہونا اور نیت کا سیدھا رہنا بھی اس کا لازمی حصہ ہے ـــ

اس کی چند خصوصیات :

۱ سیدھا راستہ صرف ایک ہوتا ہے۔ اس کی بابت کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

۲ سیدھا راستہ صرف ایک منزل کی طرف جاتا ہے۔

۳ سیدھا راستہ نقطۂ آغاز اور نقطۂ آخر کے درمیان مختصر ترین راستہ ہوتا ہے۔

۴ سیدھے راستے پر چلنے کے لیے نظروں کا منزل پر جمے رہنا ناگزیر ہے۔

۵ سیدھے راستے پر چلنا آسان ہوتا ہے---
اس لیے کہ ایک طرف رخ کر کے مسلسل آگے بڑھنا ہوتا ہے۔

۶ راستے کے سیدھے ہونے کا سائنسی و عقلی بنیاد پر تعین کیا جا سکتا ہے۔

۷ سیدھے راستے کا تعین نقطۂ آغاز کے موقع پر ہی ضروری ہے '
' اگر آغاز میں غلطی ہو جائے تو بعد میں واپسی مشکل ہوتی ہے۔

# رب اغفر وارحم

نسخہ شفا امراض روحانی

نسخہ شفا امراض جسمانی

نسخہ رد بلا و مصائب

نسخہ کشادگی رزق

نسخہ معاشی خوش حالی

نسخہ حصول اولاد

نسخہ نزول بارش

نسخہ رد قحط و خشک سالی

نسخہ باغات و انہار

نسخہ برکت فصل اناج و پھل

## استغفار — استغفار — استغفار

انفرادی بھی ، اجتماعی بھی

رسول اللہؐ دن میں سو سو بار استغفار کرتے تھے —— آپ؟

اپنے رب سے استغفار کرو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کرے گا (نوح ۷۱: ۱۰-۱۲)

(بندہ خدا)

# اسلام ۲۰۰۰ء میں : مراد ہوف مین

## ایک مطالعہ

مستنصر میر○

ترجمہ : امجد عباسی

جرمن مسلمان اسکالر مراد ہوف مین فروری ۲۰۰۰ء میں خرم مراد میموریل لیکچر دینے پاکستان تشریف لائے تھے۔ ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ الجزائر اور مراکش میں جرمنی کے سفیر رہے اور ۱۹۸۰ء میں نعمت اسلام سے فیض یاب ہوئے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ امریکہ کے رسالے Studies in Contemporary Islam میں، جس نے ممتاز احمد اور مستنصر میر کی ادارت میں حال ہی میں اشاعت کا آغاز کیا ہے، ان کی کتاب Islam:2000 پر مستنصر میر کا تبصرہ شائع ہوا ہے (ج ۱، شمارہ ۲)۔ یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے مصنف نے مقدمے میں لکھا ہے کہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ: "۲۱ ویں صدی کے آغاز پر عالم اسلام کو کیا مقام حاصل ہے اور اسے اس صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ مذہب بنانے کے لیے عالم گیر سطح پر کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے"۔ اس کے لیے انھیں "مغرب اور عالم اسلام دونوں پر کڑی تنقید کرنا ہوگی"۔

کتاب کے سات ابواب ہیں۔ پہلا باب: "A Bit of Muslim Futurology" (مسلمانوں کے مستقبل کی ایک جھلک)، تاریخ اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے تین مختلف نقطہ ہائے نظر پر مشتمل ہے۔ ایک، قنوطیت پسند (اسلام نبی کریمؐ کے دور سے مسلسل زوال پذیر ہے)، دوسرا رجائیت پسند (اسلام مستقل ترقی پذیر ہے)، اور تیسرا، دونوں کے بین بین (یعنی نشیب و فراز کا سامنا رہا ہے)۔ ہر نقطۂ نظر کے حق میں

---

○ پروفیسر، سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز، مشگن، ٹاؤن اسٹیٹ یونی ورسٹی، امریکہ

مسلم دنیا تعلیم' ابلاغیات' سیاسیات' قانون' اقتصادیات اور ٹکنالوجی' تمام محاذوں پر مابعد جدیدیت (post modernism) کے بہاؤ کا مقابلہ کر سکتی ہے" (ایضاً)۔ ہوف مین اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ مغرب اسلام سے مکالمہ چاہتا ہے: "مغرب کو مسلمانوں کے ساتھ ماورائی نوعیت کے سوالات اٹھانے میں کیا دل چسپی ہو سکتی ہے' جب کہ وہ ان سوالات کو اپنے ایجنڈے سے حذف کرنے میں بہت شان دار طریقے سے کامیاب ہو چکا ہے" (ص ۲۱)۔ ہوف مین اس تصور کو پانچویں باب' "Islam and the West: Another Showdown" (اسلام اور مغرب: ایک اور معرکہ) میں مزید آگے بڑھاتے ہیں۔ یہاں وہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ مغرب میں "اسلام وہ واحد مذہب ہے جو ہمدردی سے نظرانداز کیے جانے کی یا پرخلوص رواداری کی توقع نہیں کر سکتا" (ص ۲۷)۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب کی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ سفاکانہ دشمنی جاری ہے۔ "بوسنیا' آخری نہیں ہے بلکہ تازہ ترین صلیبی جنگ ہے---- درحقیقت صلیبی جنگوں کا عہد کبھی ختم نہیں ہوا" (ص ۳۱)۔

چھٹے باب: "How to Avoid Catastrophe and Serve Islam"? (تباہی سے کیسے بچا جائے اور اسلام کی خدمت کیسے کی جائے؟) میں مصنف عالم اسلام کے احیا کے لیے اپنا پروگرام پیش کرتے ہیں جس کے مطابق درج ذیل شعبوں میں کوشش کرنا ہوگی: "تعلیمی ٹکنالوجی' خواتین کی آزادی' انسانی حقوق' نظریہ ریاست و معیشت' جادو اور توہمات اور رسل و رسائل" (ص ۴۱)۔ اصلاحات کو "اسلام بطور مذہب اور اسلام بطور تہذیب و تمدن" ' "مستند اور گھڑی ہوئی احادیث" ' "شریعت اور فقہ" اور "قرآن اور سنت" کے درمیان واضح امتیاز پر مبنی ہونا چاہیے (ایضاً)۔ وہ مسائل جو مغرب میں اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں ان میں اسلام میں خواتین کا مقام اور حقوق اور انسانی حقوق کا مسئلہ شامل ہیں۔ ہوف مین نے ان مسائل پر کئی صفحات رقم کیے ہیں (ص ۴۴ تا ۵۵)۔ انھوں نے اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظریات کے مختلف پہلوؤں پر بھی گفتگو کی ہے (ص ۵۱-۵۶)' اور مسلمانوں کے درمیان صوفی مسلکوں اور وجدانی عوامل پر تنقیدی نظر ڈالی ہے (ص ۵۷-۵۹)۔ وہ امت مسلمہ کے اتحاد کی بات کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ وہ مسلم یکسانیت (Muslim Uniformity) کے لیے نہیں کہہ رہے ہیں (ص ۶۱)۔ وہ اسلام کی مختلف تعبیرات کی' جو مختلف مسلم جغرافیائی خطوں میں کی جا سکتی ہیں' گنجایش دیتے ہیں لیکن متنبہ بھی کرتے ہیں کہ کسی جرمن یا امریکی اسلام کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا' اگرچہ جرمنی یا امریکہ میں اسلام کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے (ص ۶۲)۔ وہ اس باب کا اختتام اس طرح سے کرتے ہیں کہ "عالم اسلام اپنی پرکشش عکاسی میں خاص طور پر نااہل دکھائی دیتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر بغیر شیو کیے' اپنی بیلٹ میں پستول لگائے یاسر عرفات کا نظارہ عرب دشمن قوتوں کے پروپیگنڈے کے لیے وہ بہترین چیز ہے جس کی وہ خواہش کر سکتے

ہیں اور وہ بھی مفت!" (ص ۶۳)۔ ان کے خیال میں صرف وہی مسلمان مغرب کے عوام کے ساتھ قابلیت سے بحث کر سکتے ہیں جو مغرب میں پلے بڑھے ہیں (ص ۶۴)۔

ساتویں باب کا عنوان ہے: "The Task ahead of us: What a Task" (ہمارے پیش نظر کام: کیا بڑا کام!!)۔ یہاں ہوف مین اسلام میں بنیادی امور اور ثانوی امور کے درمیان فرق کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں (ص ۶۶)۔ "محدود تعداد میں الہامی اور ناقابل تغیر احکامات جو قرآن پاک کے غیر متنازعہ متن میں پائے جاتے ہیں' انھیں انسانوں کے بنائے ہوئے اور نسبتاً کم مستند بنیادوں پر مبنی بہت سارے قواعد و ضوابط کے احکامات سے الگ رکھا جائے جو قابل احترام فقہا کے مجموعوں میں پائے جاتے ہیں" (ص ۷۰)۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ۲۱ ویں صدی کے لیے اسلام کی تجدید نو کا اہم ترین کام مغرب میں مقیم مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائے گا (ص ۷۱-۷۲)۔

میں نے کتاب کا خلاصہ قدرے تفصیل سے بیان کر دیا ہے اس لیے کہ میں اسے ایک اہم کتاب سمجھتا ہوں۔ کتاب عالم اسلام کے مذہبی اور علمی منظرنامے کا اہم تجزیہ پیش کرتی ہے۔ مصنف کی اسلام کے روایتی ذرائع علوم پر مضبوط گرفت ہے اور ظاہر ہے کہ مغربی علمی روایات کے حوالے سے وہ اپنے گھر ہی میں ہیں۔ انھوں نے ہر بات نئی نہیں کہی ہے اور وہ خود معروف مسلم اسکالر محمد اسد (آسٹریلوی نومسلم' سابق نام Leopold Weiss) اور دیگر سے استفادے کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہوف مین کو مذہبی رجحانات اور علمی تحریکوں کو اختصار سے پیش کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ ان کے مسیحیت اور جدیدیت جیسے موضوعات پر تبصرے قابل غور ہیں۔ عالم اسلام کی اصلاح کے لیے ان کے پروگرام دیگر جدید مسلم مفکرین کے مجوزہ پروگراموں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے مقدمے میں لکھا تھا' انھوں نے عالم اسلام اور مغرب دونوں کو تنقید سے نہیں بخشا۔ ان کے تبصرے جو کہ بیش تر بصیرت افروز اور کاٹ دار ہوتے ہیں' اس انداز سے کیے گئے ہیں کہ قاری بے اختیار تحسین کرتا ہے۔ ذیل میں بعض تنقیدی نکات پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱- ہوف مین ان مسلمانوں کی نمایندگی کرتے ہیں جن کے خیال میں اسلام اور مغرب کے درمیان حقیقی مکالمے کا امکان نہیں ہے--- اس لیے نہیں کہ اسلام اس قسم کے مکالموں کے حق میں نہیں' بلکہ لادین مغرب جو کہ پہلے ہی سے اہم مذاہب میں سے ایک عیسائیت کا حامل ہے' ماورائی نوعیت کے مسائل پر اسلام سے مکالمے میں کم دل چسپی رکھتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ مکالمے کے لیے آیا صرف یہی ممکنہ موضوع ہے؟ کیا اسلامی تہذیب کے لیے (فرض کر لیجیے کہ یہ اپنا وجود رکھتی ہے اور اس حوالے سے اس کی شناخت بھی ہے) یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے کچھ دوسری بنیادوں پر رابطہ

کرے اور ایک مشترکہ مقصد کے لیے کام کرے؟ دوسرے' اگر مغربی کلچر پہل گامی کے لیے تیار نہیں ہے' کیا اسلام پیش قدمی نہیں کر سکتا اور مغرب سے برابری کی سطح پر بات نہیں کر سکتا؟ کیا لازم ہے کہ اسلام ردعمل ہی کا اظہار کرے؟ کیا اس کے پاس اپنا کوئی تعمیری ایجنڈا نہیں ہے اور کیا یہ اسے تخلیق نہیں کر سکتا ہے؟ تیسرے' اگرچہ مغربی کلچر آج دنیا کا غالب کلچر ہے لیکن صرف یہی کلچر نہیں ہے جس سے اسلام کو سابقہ ہے۔ اسلام کے پاس بودھ اور ہندو کلچر جیسے غیر مغربی کلچر سے معاملہ کرنے کے لیے کیا راہ عمل ہے؟ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم تہذیب کے لیے ایک "عمومی نظریے" کی ضرورت ہے--- ایک ایسا نظریہ جس کی واقعاتی بنیاد مکمل طور پر محض ایک تہذیب' مغربی تہذیب سے' حاصل کردہ معلومات پر مبنی نہ ہو۔

۲- مغرب سے کیا مراد ہے' یہ غیر واضح ہے۔ "اسلام ۲۰۰۰ء" کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی فرد یہ تاثر قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہوف مین مغرب کو ایک یکساں چیز سمجھتے ہیں۔ اگر اسلام ایک یکساں چیز نہیں ہے تو اسی طرح مغرب بھی نہیں ہے۔ صرف ایک پہلو ہی کو لیجیے کہ مغرب میں قبولیت اسلام کی ایک قابل توجہ اور طاقت ور تحریک پائی جاتی ہے جس کا ایک ثبوت خود ہوف مین ہیں۔

دوسرا پہلو' یہ سوال ہے کہ تاریخی اعتبار سے کون سی تہذیب ایسی ہے جس نے دوسری تہذیبوں کے ساتھ بالغ نظری اور ہمدردی سے معاملہ کیا ہو؟ دوسرے الفاظ میں' کس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک تہذیب کے پسندیدہ تصور کو اجاگر کرے؟ مغرب کو اسلام کے مخصوص تصور کے لیے شاید ذمہ دار ٹھیرایا جا سکے' لیکن کیا مسلمانوں نے اپنی سرد مہری اور بے عملی سے اس مخصوص تصور کے حوالے سے اعانت جرم نہیں کی؟ اور کیا مسلمانوں نے مغرب کا ایک مخصوص تصور نہیں اپنا رکھا؟ اگر مخصوص تصورات اسلام اور مغرب کے درمیان صحیح سوچ کے پروان چڑھانے میں رکاوٹ ہیں' تو غالباً ایک سے زیادہ فریق مسئلے کے ذمہ دار ہیں۔

۳- کم سے کم اس کتاب کی حد تک' اسی طرح کا مسئلہ یہ ہے کہ اسلام سے کیا مراد ہے؟ ہوف مین مغرب کے نظام زندگی کی واقعی حقیقت کا مقابلہ مذہب اسلام کے مجرد نظریات سے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس مقابلے یا موازنے کو نظریے کے حق میں جھکایا جا سکتا ہے جسے ایک مربوط کل کے طور پر پیش کیا جائے' جب کہ مقابلے میں برسرعمل نظام میں تضادات کو ظاہر کیا جائے۔ مگر اس حقیقت سے قطع نظر کہ مسلم ممالک میں جو اسلامی زندگی پائی جاتی ہے اس میں بہت زیادہ ربط اور نظم نہیں ہے' کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی اور مغربی دنیائیں' الگ الگ وجود کی حیثیت سے موجود نہیں ہیں۔ مغربیت' اسلامی سرحدوں سے باہر کہیں پھل پھول نہیں رہی بلکہ یہ عالم اسلام کے عین قلب میں پائی جاتی ہے۔ مغربی ٹکنالوجی اور فکر' چاہے ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں' کروڑوں مسلمانوں کی زندگی کا جزو لازم بن چکی

ہے۔ مسلم مفکرین کے لیے ایک اہم کام یہ ہے کہ وہ یہ مطالعہ کریں کہ اولیں طور پر مغربی فکر اور کلچر عالم اسلام میں کیسے داخل ہوا؟ مغرب کو غلبہ حاصل نہ ہوتا اگر وہ طاقت ور نہ ہوتا اور اسلام پیچھے نہ رہ جاتا اگر اس کی دفاعی ڈھال میں روزن نہ ہوتے۔

۴- ہوف مین عیسائیت میں نمایاں تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہیں، وہ تبدیلیاں جنھوں نے ان کے خیال میں عیسائیت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ اس میں یہ بات مضمر ہے کہ اسلام نے جدیدیت کے بہاؤ کے مقابلے میں اپنے آپ کو قائم رکھا ہے۔ اگرچہ عیسائیت کو جدیدیت نے توڑ پھوڑ دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ مذہب ہے جس نے جدیدیت کے شدید حملے کے اولین زور کا مقابلہ کیا ہے۔ اس پیش گوئی کا کیا جواز ہے کہ جدیدیت سے مکمل جنگ میں اسلام صحیح سلامت نکل آئے گا؟ ہوف مین جیسے سنجیدہ مفکر کو خوش گمانی کا شکار قرار دینا ناانصافی ہوگی۔ لیکن مذہب اور سائنس کے درمیان تعلق کے حوالے سے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا ابھی کچھ قبل از وقت ہے۔ ۲۰ویں صدی کی فزکس ۱۹ویں صدی کی فزکس سے مختلف ہو سکتی ہے لیکن یہ ایک قابل بحث بنیادی نکتہ ہے کہ آیا جدید سائنس نے، ہوف مین کے الفاظ میں، "سائنس میں مذہب کے داخلے کے لیے دروازہ کھول دیا ہے" (ص ۲۳)۔ انتھونی گڈنز (Anthony Giddens) "The Consequences of Modernity" (جدیدیت کے نتائج) (سٹین فورڈ، ۱۹۹۰ء) کے مصنف بڑے مضبوط دلائل دیتے ہیں کہ "ہم ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہے ہیں جہاں جدیدیت کے نتائج ایسی بنیادی اور عالمی تبدیلیوں کا باعث بن رہے ہیں جو ماضی سے مختلف ہیں" (ملاحظہ کیجیے: ص ۳ اور ۴۷)۔ ضمناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائیت سائنس سے اپنے تصادم کی وجہ سے بظاہر زوال پذیر لگتی ہے۔ لیکن یقیناً یہ مقابلے سے باہر نہیں ہے جیسا کہ بڑی مقدار میں سامنے آنے والے اس لٹریچر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو عیسائیت سے گہری وابستگی رکھنے والے مفکرین کی طرف سے اس تنازع کے مختلف پہلوؤں سے متعلق پیش کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تر تنقید کے باوجود یہ کتاب، خود احتسابی کے حوالے سے موجود مختصر مسلم لٹریچر میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ہوف مین نے بہت سے اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں سے متعلق اور مسلمانوں اور غیر مسلموں سے متعلق مسائل پر بے لاگ بحث کی ہے جو کہ نئی ہزاروی میں داخل ہونے کے لیے مسلمانوں کے وژن کو واضح کرنے میں مددگار و معاون ہو سکتی ہے۔

[ یہ کتاب امانہ پبلی کیشنز نے شائع کی ہے (ای میل : igamana@erols.com)۔ پاکستانی ناشرین اور خریداران کتب کے لیے یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ۲۷۰ صفحات کی اس پیپر بیک کتاب کی قیمت پاکستانی کرنسی میں صرف ۸۰۰ روپے کے قریب ہے]

# کشمیر

پر ظلم کے سائے
بڑھتے جا رہے ہیں

اس سے پہلے کہ جنت ارضی دوزخ میں بدل جائے
اور ظلم کی بھیانک سیاہ رات طول پکڑ جائے

**کشمیر کے جاں نثاروں کا ہاتھ بٹائیے**

آزادی کے ان انمول لمحوں میں

## کشمیر

کے جاں نثاروں، مجاہدوں، مہاجروں، گرفتار شدگان
اور شہدا کے گھرانوں کو یاد رکھئے

وہ جو آزادی کی بے مثال جنگ لڑ رہے ہیں
عافیت کی گھڑیوں میں

**انھیں حوصلہ دیجئے، قوت بخشئے**

ان ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو نہ بھلایئے
جن کے سروں سے آنچل نوچے جا رہے ہیں
اور گھروں کو جلایا جا رہا ہے

**اس آگ کو بجھانے میں مدد کیجئے**

**جہاد کشمیر فنڈ**

آپ سے مالی ایثار کا تقاضا کرتا ہے

اپنے عطیات

بنام جناب **عبدالرشید ترابی** اکاؤنٹ نمبر **1797** سونیری بینک، اسلام آباد - نیشنل بینک، مظفر آباد
چیک یا ڈرافٹ بنوا کر اس پتے پر ارسال کریں:

عبدالحلیم خان (مرکزی ناظم مالیات) جماعت اسلامی، آزاد جموں و کشمیر
415- پونچھ ہاؤس، صدر، راولپنڈی- فون: 051-511417 فیکس: 051-510197
**یا** عیدگاہ روڈ، مظفر آباد، آزاد جموں و کشمیر فون: 058810-42334, 44336 فیکس: 058810-42580
**E-mail: jiajk@comsats.net.pk**

# اخبار امت

## قاضی حسین احمد کا دورہ امریکہ: دعوتی پہلو

عبدالغفار عزیز

محترم قاضی حسین احمد کے ماہ جولائی میں تین ہفتے کے دورۂ امریکہ میں' صرف ۱۸ گھنٹے ایسے تھے' جو امریکی حکام یا دانش وروں سے ملاقاتوں میں گزرے لیکن ذرائع ابلاغ نے انھی ملاقاتوں پر توجہ مرکوز رکھی اور یوں محسوس ہوا جیسے تین ہفتے وہ امریکی سرکاری ذمہ داران ہی سے ملتے رہے' حالانکہ ان چند ملاقاتوں کے علاوہ' ان کا سارا وقت امریکہ میں مقیم پاکستانیوں' عرب و امریکی مسلمانوں' عالمی صحافتی نمایندوں اور مختلف اہل علم و دعوت سے تبادلۂ خیال میں گزرا۔

ایک اندازے کے مطابق اس وقت امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ سے کچھ کم یا زیادہ ہے' ان میں ایک بہت بڑی تعداد فکر معاش سے آزاد اور آسودہ حال ہے۔ ایک معتدبہ تعداد اہم اور موثر افراد میں شمار ہوتی ہے۔ خود امریکی ذمہ داران ان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت امریکہ کے بڑے شہروں میں ہی نہیں دور دراز کی چھوٹی بستیوں میں بھی' کوئی نہ کوئی مسجد' اسلامی مرکز یا اسکول مل جاتا ہے۔ چند دہائیاں پیشتر امریکہ جانے والے مسلمان حلال کھانوں کی تلاش میں ہلکان ہو جایا کرتے تھے' اب ہر علاقے میں حلال کھانوں کے بڑے بڑے سٹور اور ہوٹل مل جاتے ہیں اور نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد بھی کبھی کبھار ان کھانوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔

اگر امریکہ میں مقیم مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو اپنا لیں' خود کو امت مسلمہ کا سفیر سمجھتے ہوئے امت کے مفادات پر نگاہ رکھیں' روحانی سکون اور ذہنی اطمینان کے متلاشی کروڑوں عوام کی اسلام کے چشمہ شیریں تک رہنمائی کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ عالم اسلام کو امریکہ سے ٹھنڈی ہوائیں نہ آنے لگیں اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے آنے والا مذہب عملاً پوری انسانیت کو اپنی آغوش شفقت و نجات میں لے لے۔

# اخبار امت

## قاضی حسین احمد کا دورہ امریکہ: دعوتی پہلو

عبدالغفار عزیز

محترم قاضی حسین احمد کے ماہ جولائی میں تین ہفتے کے دورۂ امریکہ میں' صرف ۱۸ گھنٹے ایسے تھے' جو امریکی حکام یا دانش وروں سے ملاقاتوں میں گزرے لیکن ذرائع ابلاغ نے انھی ملاقاتوں پر توجہ مرکوز رکھی اور یوں محسوس ہوا جیسے تین ہفتے وہ امریکی سرکاری ذمہ داران ہی سے ملتے رہے' حالانکہ ان چند ملاقاتوں کے علاوہ' ان کا سارا وقت امریکہ میں مقیم پاکستانیوں' عرب و امریکی مسلمانوں' عالمی صحافتی نمایندوں اور مختلف اہل علم و دعوت سے تبادلہ خیال میں گزرا۔

ایک اندازے کے مطابق اس وقت امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ سے کچھ کم یا زیادہ ہے' ان میں ایک بہت بڑی تعداد فکر معاش سے آزاد اور آسودہ حال ہے۔ ایک معتدبہ تعداد اہم اور موثر افراد میں شمار ہوتی ہے۔ خود امریکی ذمہ داران ان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت امریکہ کے بڑے شہروں میں ہی نہیں دور دراز کی چھوٹی بستیوں میں بھی' کوئی نہ کوئی مسجد' اسلامی مرکز یا اسکول مل جاتا ہے۔ چند برس پیشتر امریکہ جانے والے مسلمان حلال کھانوں کی تلاش میں ہلکان ہو جایا کرتے تھے' اب ہر علاقے میں حلال کھانوں کے بڑے بڑے سٹور اور ہوٹل مل جاتے ہیں اور نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد بھی کبھی کبھار ان کھانوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔

اگر امریکہ میں مقیم مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو اپنا لیں' خود کو امت مسلمہ کا سفیر سمجھتے ہوئے امت کے مفادات پر نگاہ رکھیں' روحانی سکون اور ذہنی اطمینان کے متلاشی کروڑوں عوام کی اسلام کے چشمۂ خیر تک رہنمائی کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ عالم اسلام کو امریکہ سے ٹھنڈی ہوائیں نہ آنے لگیں اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے آنے والا مذہب عملاً پوری انسانیت کو اپنی آغوش شفقت و نجات میں لے لے۔

یہی وہ بنیادی سبب تھا جس کی وجہ سے امیر جماعت نے حلقہ اسلامی شمالی امریکہ (ICNA) کے سالانہ کنونشن کا دعوت نامہ اس سال بھی قبول کرلیا۔ یہ تین روزہ کنونشن' بالٹی مور کے عین قلب میں واقع بہت بڑے کنونشن سنٹر میں منعقد ہوا اور اس میں نہ صرف امریکہ کے دور دراز علاقوں سے مندوبین آئے بلکہ کینیڈا کے منجمد علاقوں تک سے کل تقریباً ۱۰ ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ ۴ جولائی امریکہ کا یوم آزادی ہے۔ اس موقع پر قدرے طویل تعطیلات ہوتی ہیں۔ ان دنوں میں تقریباً سب امریکی شہری سیرو تفریح کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر شہر میں آتش بازی اور ہلا گلا عروج پر ہوتا ہے۔ حادثات کا تناسب کئی گنا بڑھ جاتا ہے' امن و امان کے اداروں' فائر بریگیڈ اور ہسپتالوں کے عملوں کو لمبی ڈیوٹی دینا پڑتی ہے کیونکہ "آزاد" معاشرہ اس روز محو جشن ہوتا ہے۔ اسی طوفان عشرت میں' حلقہ اسلامی امریکہ مسلمان برادری کو ایک گوشہ عافیت مہیا کرتا ہے۔ اپنے پورے خاندان سمیت دور دراز سے آنے والوں کے لیے اس سفر میں تفریح بھی ہوتی ہے اور روحانی سکون بھی۔ والدین اپنے بچوں کو اسلامی آداب سے آراستہ ایک ماحول سے متعارف کروانا چاہتے ہیں' اور اس طرح مسلمان نسلوں کو اپنی اساس و شناخت سے وابستہ رکھنے کی ایک کامیاب عملی کوشش ہوتی ہے۔

تین روزہ کنونشن میں خطاب کے لیے محترم قاضی صاحب کے علاوہ امیر جماعت ہند مولانا سراج الحسن' مولانا یوسف اصلاحی اور بنگلہ دیش جماعت کے نمایندے بھی آئے ہوئے تھے۔ معروف امریکی اسکالر جان اسپوزیٹو بھی موجود تھے جو مغرب اور اسلام پر بحث و تحقیق کے واشنگٹن یونی ورسٹی میں قائم ادارے کے سربراہ ہیں۔ ان تین دنوں میں ہر طرف تحجاب و اخوت کا ماحول تھا۔ اگر وہاں شرکا کو کوئی پروگرام سننے کو نہ بھی ملتا' تب بھی یہ ماحول انھیں بہت سے بھولے اسباق یاد دلانے کے لیے کافی ہوتا۔

محترم قاضی حسین احمد نے ان تین دنوں میں پانچ مختلف اجلاسوں سے خطاب کیا' اسلامی اخلاقیات بھی زیربحث آئیں' حکمت دعوت اور تبلیغ کی اہمیت پر بھی بات ہوئی' پاکستان کے حالات پر سوالات ہوئے اور امت کو درپیش مسائل پر بھی گفتگو ہوئی۔ کنونشن کے دوران انفرادی ملاقاتوں کے دور بھی چلے اور مشاورتی مجالس بھی منعقد ہوئیں۔ تین روزہ کنونشن کے بعد مختلف امریکی شہروں کے دورے کا پروگرام تھا۔ اورلینڈو اور میامی ریاست فلوریڈا کے باہم قریب شہر ہیں' یوں جیسے کراچی اور حیدر آباد۔ لیکن پروگرام صرف اسی طرح ترتیب دیا جا سکا کہ پہلے تقریباً تین گھنٹے کی پرواز سے اورلینڈو جائیں' دن بھر کے پروگرام کے بعد اگلی صبح فجر کے بعد تقریباً پانچ گھنٹے سفر کرتے ہوئے ڈیٹرائٹ جائیں۔ وہاں مسلسل پروگراموں کے بعد اگلی صبح فجر کے بعد پھر کوئی پانچ گھنٹے کا سفر کرتے ہوئے میامی جائیں اور دن بھر کے پروگراموں کے بعد اگلی فجر کے بعد واشنگٹن کے لیے روانہ ہو جائیں۔ مسلسل سفر کا یہی عالم واشنگٹن سے نیویارک اور وہاں سے کینیڈا کے شہر

ٹورانٹو پھر دارالحکومت اوٹاوا اور واپس نیویارک کے لیے رہا۔

ہر شہر میں مسلسل پروگراموں کی کیفیت یہ تھی کہ پہنچتے ہی چائے کی تعارفی نشست سے آغاز ہو جاتا اور پھر ایک اسلامی سنٹر سے دوسرے' دوسرے سے تیسرے' ایک مسجد سے دوسری' دوسری سے تیسری..... رات ساڑھے بارہ ایک بجے بمشکل استراحت کے لیے وقت ملتا۔

یہ مسلسل سفر اور بلاتوقف پروگرام دورۂ امریکہ کی اصل روح تھے۔ ہر جگہ نئے احباب' نئے ساتھی اور نئے متلاشیان حق ملتے' اسلام اور مسلمانوں کے حال و مستقبل پر سوالات ہوتے' امریکہ میں پروان چڑھنے والی مسلمان نسلوں کے مسائل سامنے آتے' اغیار کی سازشوں کے متعلق سوالات ہوتے' اپنوں کی بے حسی و بدعملی پر اظہار تشویش کیا جاتا اور امیر جماعت ہر سوال' ہر خدشے کا بے لاگ تجزیہ کرتے ہوئے دلوں میں امید و رجا کے چراغ جلاتے جاتے۔ ایک شہر میں وہاں کے بااثر اور درد دل رکھنے والے پاکستانیوں نے اس جذبے کا اظہار کیا کہ دیگر مذاہب و ممالک کے لوگ کم تعداد میں ہونے کے باوجود منظم' موثر اور فعال ہیں۔ ہم کثیر تعداد میں ہونے کے باوصف بھی منتشر اور پراگندہ حال ہیں۔ امیر جماعت نے اس احساس پر تحسین کرتے ہوئے کہا کہ آپ تمام مسلم مراکز' مسلم آبادی اور موثر افراد کو یکجا کرنے کا آغاز کریں' ہمیں ہر قدم پر اپنے شانہ بشانہ اور اپنے سے آگے پائیں گے۔ قاضی صاحب نے خود بھی اس ضمن میں فعال کردار ادا کرنے کا وعدہ کیا اور یہ امید روشن تر ہوگئی کہ امریکہ میں موجود ۹۰ لاکھ سے زائد مسلمانوں کو متحدہ طاقت بنانے کے لیے آنے والے سالوں میں زیادہ ٹھوس اور جان دار اقدام سامنے آئیں گے۔

اسلامی تحریک اور اسلامی تعلیمات کا اعجاز ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کا رہنما صرف پاکستانیوں کا مہمان نہیں تھا۔ عرب' افریقی' افغان اور خود امریکی مسلمان مصر تھے کہ قاضی حسین احمد ان کے پاس بھی آئیں۔ صرف امریکی پالیسی ساز ادارے ہی ان کے ساتھ تبادلۂ خیال نہیں چاہتے تھے' عرب قوم پرست بھی اپنے تحقیقی اداروں میں انھیں مدعو کر رہے تھے اور الحمدللہ ہم نے بھرپور کوشش کی کہ ہر مفید دعوت پر لبیک کہا جائے۔

ان اداروں اور افراد سے ملاقاتوں کی تفصیل تو یہاں ممکن نہیں لیکن ایک ملاقات کا حال عرض کرتا ہوں۔ امام سراج وہاج سیاہ فام امریکیوں کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ سادہ مزاج' فقیرانہ رنگ لیکن متحرک و دبنگ' اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنے والے' گذشتہ سال بھی قاضی صاحب سے ملنے حلقہ اسلامی کے مرکز میں آئے تھے' اس سال ان کے مرکز میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا مرکز ایسے علاقے میں واقع ہے جو جرائم پیشہ افراد کا گڑھ تھا۔ وہاں جاتے ہوئے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔ دن کے وقت بھی سرعام منشیات فروش ڈاکوؤں کا راج ہوتا تھا جو کسی بھی راہ گیر کو روک کر "جو کچھ ہے نکال دو" کا کاشن دیتے

اور نہ ماننے والے کا بھرکس نکال دیتے تھے۔

امام سراج وہاج نے وہاں نرمی و محبت سے دعوت الی اللہ کا آغاز کیا، لاتعداد سیاہ فام مسلمان ہوگئے، ان کے خطاب کے وقت مسجد کا دامن تنگ پڑنے لگا اور پھر انھوں نے اعلان کر دیا کہ آیندہ سے اس علاقے میں جرائم پیشہ لوگوں کا داخلہ بند ہے۔ اگر کوئی منشیات فروش یا جرائم پیشہ دکھائی دیا تو وہ اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اب وہی علاقہ امن و آشتی کا علاقہ ہے۔ امریکی حکام بھی امام سراج وہاج کے کردار کے معترف ہیں، بلکہ ان کے لیے ایوارڈ کا اعلان کر چکے ہیں اور امام سراج اسی نرمی و محبت سے لوگوں کے دل جیتتے چلے جا رہے ہیں۔

امام سراج وہاج سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی۔ آخر میں وہ بار بار یہی کہتے کہ قاضی صاحب، آپ نے مجھے کام کرنے کا نیا حوصلہ دیا، آپ نے میرے جذبوں کو جوان کر دیا اور قاضی صاحب انھیں کہہ رہے تھے کہ آپ کے کام کو دیکھ کر اور آپ کی باتیں سن کر ہمیں نئی ہمت و ولولہ ملتا ہے۔ اس ملاقات میں دیگر امریکی مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا گیا، آیندہ کے امکانات و خدشات زیربحث آئے اور باہم ربط و ضبط بڑھانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ہم نے امام سراج سے جماعت کے سالانہ اجتماع میں شرکت کا وعدہ لیا۔

امریکہ میں مقیم مسلمان ایک قوت اور حقیقت ہیں۔ یہ قوت اور خود پاکستان میں جماعت اسلامی کی اہمیت و منزلت، امریکی ذمہ داران میں بھی، مسلمانوں کے ساتھ گفت و شنید کی ضرورت کا احساس پیدا کر رہی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس صورت حال میں امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے باہمی ربط کے لیے اقدامات کریں اور امریکی معاشرے اور ذمہ داران کے سامنے اسلام کا حقیقی اُجلا چہرہ پیش کریں۔

۲

## بنگلہ دیش میں دینی مدارس: نئے رجحانات

ڈاکٹر ممتاز احمد ○

دنیا میں، عالم اسلام میں، سب سے زیادہ عربی مدارس، مدارس کے اساتذہ اور مدارس کے طلبہ بنگلہ دیش میں ہیں۔ یہ امتیاز کسی اور مسلمان ملک کو حاصل نہیں ہے۔ اس وقت بنگلہ دیش میں ۲۰ لاکھ ایسے

---

○ پروفیسر، ہیمپٹن یونی ورسٹی، امریکہ۔ یہ تحریر دینی مدارس پر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے سیمی نار منعقدہ ۳ جولائی ۲۰۰۰ء میں پیش کی جانے والی گفتگو پر مبنی ہے۔

افراد ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے مدارس سے وابستہ ہیں۔

بنگلہ دیش میں تین طرح کے مدارس ہیں: ایک، وہ جو حکومت سے کوئی امداد اور تعاون نہیں لیتے، نجی ہیں۔ ان کو قومی یا خارجی مدارس کہتے ہیں۔ دوسرے، عالیہ مدارس ہیں جو نجی ہیں لیکن حکومت سے مالی اعانت وصول کرتے ہیں۔ تیسرے، خالصتاً سرکاری مدارس ہیں جن کی تعداد چار ہے۔ ان کو بھی عالیہ مدرسہ کہا جاتا ہے۔ ایسے عالیہ مدرسے ڈھاکہ، بوگرہ، راج شاہی اور جیسور میں ہیں۔ قومی مدرسوں کی تعداد ۶ ہزار ۵ سو ہے۔ یہاں مکمل درس نظامی پڑھایا جاتا ہے۔ اس میں سے ۳۰ فی صد مدارس میں دورہ حدیث بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں ایسے مدارس کی تعداد صرف ۱۲ یا ۱۳ فی صد تھی جہاں دورہ حدیث کا انتظام تھا۔ اس اضافے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے بنگلہ دیش کے علما کی بہت بڑی اکثریت درس نظامی مکمل کر کے دورۂ حدیث کے لیے دیوبند جایا کرتی تھی لیکن بھارتی حکومت نے اس خطرے کے پیش نظر کہ یہ سارے لوگ آئی ایس آئی کے ایجنٹ کے طور پر بھارت جائیں گے، ویزے بند کر دیے۔ اس کے نتیجے میں بنگلہ دیش میں مدارس نے خود دورہ حدیث کے انتظامات کیے۔ اس وقت صرف ڈھاکہ میں ۲۸ مدارس ایسے ہیں جہاں دورۂ حدیث ہوتا ہے۔ قومی مدارس کے اساتذہ کی تعداد ایک لاکھ ۳۰ ہزار اور طلبہ کی تعداد ۱۴ لاکھ ۶۲ ہزار ۵ سو ہے۔

عالیہ مدارس میں درس نظامی کے ساتھ جدید علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ ان مدارس کو حکومت، اساتذہ کی تنخواہوں کا ۸۰ فی صد اور توسیع و ترقی کے لیے ۷۵ فی صد تک امداد دیتی ہے۔ یہ مدارس پوری طرح سے نجی ہیں لیکن ان کے امتحانات کلی اور داخلی سطح پر ایک مدرسہ ایجوکیشن بورڈ لیتا ہے جو حکومت کا ادارہ ہے۔ ان مدارس کی تعداد ۶ ہزار ۹ سو ۶ ہے۔ ان میں اساتذہ کی تعداد ایک لاکھ ۱۷ ہزار ۲ سو ہے، جب کہ طلبہ کی تعداد ۱۸ لاکھ ۸۷ ہزار ۳ سو ہے۔

چار سرکاری عالیہ مدارس میں طلبہ کی تعداد اوسطاً ۳ ہزار ہے۔ ان کے اخراجات ۱۰۰ فی صد حکومت کرتی ہے۔ طالبات کے قومی مدارس کی تعداد ۲۰۰ کے قریب ہے۔ طالبات کے ان مدارس میں مکمل درس نظامی پڑھایا جاتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان مدارس میں ۲۰ فی صد اساتذہ خواتین ہیں جو خود عالمہ دین ہیں۔

ایک عمل جو جنرل ارشاد کے زمانے سے شروع ہوا وہ ابتدائی مدارس / مکتب کا قیام ہے جو مسجدوں سے بھی منسلک ہیں اور مسجدوں سے الگ بھی ہیں۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ۱۸ ہزار ہے۔ ان میں اساتذہ کی تعداد ۸۵ ہزار ہے اور طلبہ کی تعداد ۲۰ لاکھ ہے۔ اس طرح ابتدائی، قومی، عالیہ، سرکاری و غیر سرکاری سب ملا کر تقریباً ۳۲ ہزار مدارس ہیں اور ان میں طلبہ اور اساتذہ کی مجموعی

تعداد ۶۰ لاکھ ہے۔

تمام قومی مدارس میں انگریزی زبان لازمی قرار دی گئی ہے۔ اس وقت کوئی ایک بھی ایسا قومی مدرسہ نہیں ہے جس میں انگریزی زبان نہ پڑھائی جاتی ہو۔ ان مدارس میں انگریزی کی تدریس کے معیار میں ضرور فرق ہوگا' کسی میں بہتر ہے کسی میں کم بہتر' لیکن پڑھائی ہر جگہ جاتی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ تمام قومی مدارس میں پرائمری ایجوکیشن تدریس کا حصہ بنا دی گئی ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ طلبہ کو براہ راست درس نظامی میں لیا جاتا تھا۔ اب پرائمری تعلیم درس نظامی کا لازمی حصہ بن گئی ہے۔ جو بچہ پرائمری اسکول سے شروع کرتا ہے' اسے سائنس' سوکس' جغرافیہ' انگریزی زبان' بنگلہ زبان' سب پڑھایا جاتا ہے۔ پرائمری کا یہ سارا نصاب پڑھ کے طالب علم درس نظامی میں جاتا ہے۔

تقابل ادیان سارے مدارس میں شامل کر لیا گیا ہے۔ بنگلہ دیش میں تقابل ادیان سے مراد یہودیت' عیسائیت' بدھ ازم اور ہندوازم ہے۔ ایک اور تبدیلی جو آئی ہے وہ یہ کہ مدارس پاکستان کی طرح اپنے اپنے وفاق میں شامل ہیں۔ اس وقت دو بڑے وفاق ہیں۔ ایک "وفاق المدارس" ہے جس کا صدر مقام پوٹھیاں مدرسہ ہے جو چٹاگانگ کے پاس ہے۔ دوسرا "انجمن اتحاد المدارس" ہے جس کا صدر مقام ڈھاکہ میں ہے۔ ایک کے ساتھ ایک ہزار ۱۵ سو اور دوسرے کے ساتھ ۸۵۰ مدارس کا الحاق ہے۔ یہ دونوں وفاق ہر سال کے امتحان الگ لیتے ہیں اور فائنل امتحان الگ لیتے ہیں۔ پورے بنگلہ دیش میں ایک وقت میں امتحانات ہوتے ہیں۔ امتحانی مراکز' نگران اور سپروائزر سب خود مقرر کرتے ہیں اور سندیں وفاق کی طرف سے دی جاتی ہیں۔ ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ داخلے' امتحان' سب پیشہ ورانہ انداز سے ہو رہے ہیں۔ تین چار مدرسے ایسے ہیں جن کا سارا ڈیٹا کمپیوٹر پر موجود ہے۔

کئی مدارس میں ٹیکنیکل ایجوکیشن بھی بڑی حد تک ہے۔ ۸ ہزاری مدرسہ بھارت بلکہ پورے برعظیم میں دوسرا بڑا مدرسہ ہے' دیوبند سے ۷ سال بعد قائم ہوا' اس کی صد سالہ سالگرہ ابھی منائی جانے والی ہے۔ اس میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کا پورا انتظام ہے۔ ٹیکنیکل سے مراد محض جلدبندی نہیں ہے' بلکہ باقاعدہ ان کو جدید ٹیکنیکل مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پوٹھیاں مدرسہ جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا اس میں بھی ٹیکنیکل تعلیم دی جاتی ہے۔ پوٹھیاں مدرسے میں' میں نے دیکھا کہ تقریباً ۵۰ فی صد طالب علم ایسے تھے جو فاضل / گریجویٹ ہونے کے بعد کسی بھی ہسپتال میں جا کر میڈیکل پریکٹیشنر کے طور پر کام کر سکتے تھے۔ ہر شخص کو انجکشن لگانا آتا تھا' مرغیوں کو بھی اور انسانوں کو بھی۔ ہر شخص بنیادی طبی کورس کر چکا ہوتا ہے۔

اے زیڈ ایم شمس العالم صاحب جو العرفہ اسلامی بنک کے چیئرمین ہیں' انھوں نے مجھے بتایا کہ دو سال

پہلے انھوں نے قومی مدرسوں سے درس نظامی کے فارغ گریجوایٹس کو اپنے بنک میں آفیسر کے طور پر ملازمت میں لیا۔ اس وقت ان کے بنک میں ۶۰ افسر ہیں جن کے پاس کوئی انگریزی کی تعلیم نہیں تھی۔ انھوں نے کسی کالج یا یونی ورسٹی سے بی کام یا ایم بی اے نہیں کیا تھا' درس نظامی کے فارغ التحصیل تھے۔ انھوں نے ان ۶۰ طالب علموں کو ۶ ماہ کی ٹریننگ دی۔ میرے اس موجودہ دورے کے دوران انھوں نے مجھے ان سے ملوایا۔ ان کے منیجنگ ڈائرکٹر کا یہ کہنا تھا کہ ان کی پیشہ ورانہ کارکردگی' جدید پڑھے لکھوں سے بدرجہا بہتر تھی۔ وہاں ایک راستہ یہ بھی کھل رہا ہے اور اس پر یہاں ہمیں سوچنا چاہیے۔

عالیہ مدارس کی روایت کو دیکھنا چاہیے۔ عالیہ مدرسے میں میٹرک' ایف اے' بی اے' ایم اے ان چار سطحوں تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اسے داخل' عالم' فاضل اور کامل کہتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی حکومت نے داخل کو میٹرک کے اور عالم کو انٹرمیڈیٹ کے برابر تسلیم کر لیا ہے۔ نتیجتاً عالیہ مدرسے کے ۸۰ فی صد گریجوایٹس قومی تعلیم کے دھارے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ڈھاکہ یونی ورسٹی' چٹاگانگ یونی ورسٹی اور راج شاہی یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیتے ہیں اور پھر اپنے اپنے مضامین میں ایم اے' بی اے کر لیتے ہیں۔ اس وقت بنگلہ دیش کی سول سروس' آرمی' پرائیویٹ سیکٹر میں' بنک کاری میں بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو عالیہ مدرسوں کے گریجوایٹس ہیں۔ وہ درس نظامی کے مکمل طور پر ماہر ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے ایف اے' بی اے سطح کے جدید مضامین بھی پڑھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ڈھاکہ' راج شاہی' چٹاگانگ' جہانگیر نگر' ان ساری یونی ورسٹیوں میں فارسی' اردو' عربی' اسلامی تاریخ' اسلامیات' ان تمام شعبوں کے ۱۰۰ فی صد اساتذہ عالیہ مدرسوں کے گریجوایٹس ہیں۔ پاکستان کی یونی ورسٹیوں میں اس کا بہت کم امکان پایا جاتا ہے۔ عالیہ مدرسوں سے بہت سے نامی گرامی لوگ نکلے ہیں۔ اس وقت بنگلہ دیش کے جو چوٹی کے اہل علم و دانش ہیں' ان کی خاصی بڑی تعداد عالیہ مدارس سے نکلی ہے۔

۱۹۷۲-۷۳ء میں جب شیخ مجیب الرحمٰن یہاں سے واپس گئے تو انھوں نے مدرسوں کے اوپر ایک وار کرنے کی کوشش کی۔ "قدرت خدا کمیشن" بٹھایا گیا' اس کمیشن کی بنیادی رپورٹ یہی تھی کہ مدرسوں کے نظام کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ان کو ختم کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ یہ مدارس دلالوں اور رضاکاروں کے مراکز تھے اور پاکستان کی حمایت کرنے والوں کی بڑی تعداد دراصل انھی مدرسوں کے طلبہ کی تھی۔

دوسری طرف سیکولر عناصر کا خیال تھا کہ اسلام کی جڑیں اس ملک میں اس وقت تک مستحکم رہیں گی جب تک یہ مدارس رہیں گے۔ "قدرت خدا کمیشن" نے رپورٹ کے ساتھ ہی ایک سروے کیا کہ ہماری سفارشات کے بارے میں لوگوں کا ردعمل کیا ہے۔ اس سروے کے جواب دینے والوں میں یونی ورسٹیوں

کے پروفیسر اور مغربی تعلیم یافتہ دانش ور تھے۔ ان میں سے ۹۰ فی صد لوگوں نے یہ کہا کہ مدرسوں کو نہ چھیڑا جائے اور ۹۵ فی صد نے یہ کہا کہ مدرسوں کو کسی نہ کسی صورت میں ہر حالت میں باقی رکھا جائے۔ اس سروے سے شیخ مجیب الرحمن کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھوں نے اپنا ارادہ جو تبدیل کیا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں معلوم تھا کہ عوام کے اندر اور خاص کر مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے اندر مدرسوں کے لیے کتنی خیرسگالی پائی جاتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں مدارس کی عوام میں وہ بنیاد، وہ روابط (linkages)، وہ ہمدردی اور خیرسگالی نہیں ہے جو بنگلہ دیش میں مدارس کی تھی کہ مغرب زدہ طبقہ بھی کھڑا ہو گیا اور انھوں نے کہا کہ آپ ان مدرسوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔

دو رجحانات کا میں خاص طور پر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں:

میرپور ڈھاکہ میں ایک مدرسہ حال ہی میں تعمیر کیا گیا ہے جس کا نام ہے دارالارشاد مدرسہ۔ اس مدرسے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف کالج گریجوایٹس کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ پہلے آپ کے پاس یونی ورسٹی کی بی اے کی ڈگری ہو، پھر آپ کو درس نظامی میں داخلہ دیا جائے گا۔

میرپور ڈھاکہ میں ایک اور مدرسہ دو سال سے قائم ہے، اس کا نام ہے ڈھاکہ کیڈٹ مدرسہ۔ اس میں عام مضامین کے لیے ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسلامی علوم کے لیے عربی۔ میں اس مدرسے میں گیا اور آپ یقین کیجیے کہ ان کے طلبہ ڈھاکہ یونی ورسٹی کے گریجوایٹس سے بہت بہتر، بے انتہا خوب صورت انگریزی بولتے تھے، بلکہ ان کے علم کی وسعت بھی یونی ورسٹی گریجوایٹس کے مقابلے میں بہتر تھی۔ یہ مدرسہ اور اس طرح کے دو تین مدرسے عنقریب چٹاگانگ میں شروع کیے جانے والے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس مدرسے کا گریجویٹ بنگلہ دیش کے چوٹی کے انگلش میڈیم اسکولوں کے گریجوایٹس کے مقابلے میں کھڑا ہو سکتا ہے۔

ایک آخری بات، میں ڈھاکہ میں تھا جب وزیر خزانہ کبریا نے اس سال کا بجٹ پیش کیا۔ اخبار پر نظر پڑی کہ بجٹ میں ۵ سو کروڑ ٹکا مدارس کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اسی سیمی نار میں ایک صاحب نے بتایا ہے کہ حکومت پاکستان نے بہ کمال مہربانی ۱۵ لاکھ روپے کی "خطیر" رقم پاکستانی مدارس کی تعمیر و ترقی کے لیے عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے!

---

# رسائل و مسائل

## سب سے اچھی دعا

سوال: دعائیں تو ہم مانگتے رہتے ہیں۔ یہ بتایئے کہ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ دعا کون سی ہے جو اس سے مانگی جائے؟ عام طور پر تو لوگ اپنے مطلب کی دعائیں مانگتے ہیں۔

جواب: عام لوگ ہوں یا خاص لوگ، سب ہی اللہ کے محتاج ہیں اور سب کا مقصود و مطلوب، آخرت کی سرخروئی و کامیابی، جنت کا حصول اور دنیا کی بھلائی اور کامیابی ہے۔ دنیا سے اللہ کے خاص بندے بھی صرف نظر نہیں کر سکتے۔ دنیا کی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق گزارنا ہی دین ہے۔ خاص ہوں یا عام بہرحال ہر بندے کو اسی دنیا میں زندگی گزار کر آخرت کی سرخروئی حاصل کرنی ہے۔ اسی لیے یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (البقرہ ۲:۲۰۱)

اے ہمارے رب، ہمیں دنیا کی زندگی میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھلائی عطا فرما اور ہم کو آتش جہنم کے عذاب سے بچا۔

خدا کے مقبول بندے صرف یہی نہیں کہ آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھلائی کی بھی دعا کرتے ہیں، بلکہ دنیا کی بھلائی کا تذکرہ پہلے کرتے ہیں اور آخرت کی بھلائی کا تذکرہ بعد میں۔ اس لیے کہ واقعہ کے لحاظ سے بھی دنیا کی زندگی پہلے ہے، اس سے پہلے سابقہ پڑتا ہے اور آخرت کی زندگی بعد میں ہے، اس سے بعد میں سابقہ پڑے گا۔ اور اس لیے بھی کہ آخرت کو بنانے اور وہاں سرخروئی حاصل کرنے اور خدا کو راضی کرنے کا واحد ذریعہ بھی ہمارے پاس صرف یہی دنیا کی زندگی ہے جو پہلے ملی ہے، اسی کی بدولت ہم آخرت میں جنت حاصل کر سکیں گے۔ یہی ہماری واحد پونجی ہے۔ یہ اگر ہم نے ضائع کر دی تو پھر جنت حاصل کرنے اور خدا کی رضا پانے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اسی زندگی کو دیکھ کر حشر کا منصف ہمارے بارے میں جنت کا فیصلہ کرے گا یا جہنم کا، اس لیے بندہ دنیا کو اہمیت دیتا ہے۔ اپنی دعا میں پہلے اسی کا ذکر کرتا ہے، اور اس کی بھلائی کا طالب بھی ہوتا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ جو مومن مرد اور مومنہ عورت نیک عمل کرے اور وہ صاحب ایمان بھی ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ حیات طیبہ عطا فرمائے گا۔ دنیا میں حیات طیبہ بہت بڑی نعمت ہے، اسی لیے بندہ مومن اس کی دعا کرتا ہے۔ دراصل ہر بندہ عاجز و درماندہ ہے۔ اس زندگی میں بھی ایک ایک سانس کے لیے اللہ کا محتاج ہے، اور اس زندگی میں بھی اللہ کی نظرِعنایت نہ ہو تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ زندگی کے ہر ہر لمحے کے لیے وہ خدا کا محتاج ہے۔ اس عاجزی، بے بسی، بے مایگی اور سراسر احتیاج کا حقیقی اور گہرا احساس ہی بندے کی اصل متاع ہے اور جن بندوں کا یہ احساس جس قدر گہرا ہے، وہی خوش نصیب، خدا کے خاص بندے ہیں۔ اسی شانِ بندگی پر خدا کو پیار آتا ہے، اسی احساس بندگی سے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی ہیں اور انھی دھڑکنوں کی ترجمان دعا ہے۔

دعا دراصل صرف ان الفاظ کو زبان سے ادا کر لینے کا نام نہیں ہے، جن کو دعا کے لیے ہم استعمال کرتے ہیں یا جو ہم نے دہرانے کے لیے رٹ لیے ہیں۔ دعا دل کی کیفیت، عجز و احتیاج اور دھڑکنوں کو زبان سے بیان کرنے کا نام ہے۔ وہ الفاظ جن میں عجز و احتیاج اور زندگی و بیچارگی کی چاشنی نہ ہو، وہ دعا نہیں، دعا کا مظاہرہ ہے۔ دعا کے مظاہرے کی تحقیر ہرگز مقصود نہیں ہے، مگر حقیقت میں دعا وہی ہے جو اس گہرے احساس اور قلب کی اس کیفیت کے ساتھ مانگی جائے کہ بندہ واقعی، سراپا احتیاج و بے مایہ ہے اور دینے والی ذات صرف وہی ہے جس کے حضور ہاتھ پھیلا کر وہ بھیک مانگ رہا ہے۔ اس پہلو سے سوچیں تو نہ کوئی عام ہے نہ خاص، ہر ایک محتاج و بے نوا ہے بلکہ اپنے تذلل اور احتیاج کا جس کو زیادہ احساس ہے، وہی خاص ہے۔

پھر یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ بندہ دونوں جہاں میں اپنے رب کی توجہ، عنایت، کرم اور مدد کا محتاج ہے۔ اس لیے ایسا سمجھنا کہ دنیا کے مقاصد کے لیے رب سے دعائیں مانگنا کچھ کم تر درجے کی بات ہے، صحیح نہیں ہے بلکہ دنیا کے لیے دعا نہ مانگنا کم تر درجے کی بات ہے۔ اپنے مقاصد کے لیے رب کے حضور گڑگڑانا اور مانگتے رہنا ہی بلندی کی بات ہے۔ اپنی ہر بشری اور دنیوی ضرورت اور اخروی کامیابی کے لیے برابر مانگنا اور اس کے آگے جھولی پھیلانا ہی شانِ بندگی ہے۔ اللہ کی رحمت اور فیضانِ کرم کے دروازے اسی خوش نصیب بندے کے لیے کھلتے ہیں جو اس کے حضور ہاتھ پھیلاتا ہے اور عجز و تذلل کے ساتھ دعا کی توفیق پاتا ہے۔

اللہ سے مانگنے کے لیے سب سے اچھی دعا کون سی ہے؟ اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے میں اللہ کے سچے رسولؐ کی زبان سے آپ کو بتاتا ہوں۔ اس میں یہ بات بھی ہے کہ سب سے اچھی دعا کیا ہے اور یہ بھی اسی میں مضمر ہے کہ دنیا کے لیے دعا کرنا بھی مطلوب و پسندیدہ ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے ایک روایت منقول ہے: قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ فُتِحَ لَهٗ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَآءِ فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ وَمَا سُئِلَ شَيْئًا يَعْنِي اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ اَنْ يُسْئَالَ الْعَافِيَةَ (جامع ترمذی)، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: "تم لوگوں میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا، سمجھ لو کہ اس کے لیے رحمت و نوازش کے دروازے کھل گئے اور بندے کی دعاؤں میں سب سے اچھی دعا جو اللہ سے مانگی جائے وہ یہ ہے کہ اس سے عافیت کی دعا کی جائے"۔

"عافیت" بہت ہی جامع لفظ ہے۔ بلاشبہ اس لفظ میں آخرت کی عافیت، وہاں کی سلامتی، وہاں کے رنج و خوف سے حفاظت اور وہاں کی سرخروئی اور اطمینان و سکون بھی شامل ہے لیکن یہ لفظ زبان سے ادا کرتے ہوئے ذہن پہلے دنیا کی عافیت اور یہاں ہر طرح کے ظاہری اور باطنی آفات و مصائب سے حفاظت اور سلامتی و عافیت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بندہ عافیت کی دعا کر کے ہر طرح کے آلام و مصائب، امراض و پریشانی، ذہنی و جسمانی دکھ درد، معذوری و لاچاری، فقر و فاقہ، لوگوں کے ظلم و اذیت اور خدا کی ناراضی و غضب، غرض ہر طرح کی ظاہری باطنی مصائب و آلام، تمام دنیوی اور اخروی رنج و خوف سے عافیت اور حفاظت کی دعا کرتا ہے۔

عافیت و امن کے جامع مفہوم کو نظر میں رکھ کر غور کیجیے کہ جو شخص اس مفہوم میں اللہ سے واقعی عافیت کا طالب ہے، وہ حقیقت میں اپنی عاجزی، بے بسی، تذلل اور بے کسی کا گہرا احساس رکھتا ہے اور ہاتھ اٹھا کر اپنے اس احساس عجز کا اظہار کرتا ہے کہ اے پروردگار! میں ہر ہر لمحے تیری عنایت، توجہ اور رحم و کرم کا محتاج ہوں۔ تیرا کرم نہ ہو تو میں ایک سانس بھی نہیں لے سکتا۔ تیرا کرم نہ ہو اور تو نہ بچائے تو اپنے بل بوتے پر میں ہرگز کسی بڑی یا چھوٹی مصیبت سے نہیں بچ سکتا۔ تیری عنایت نہ ہو تو میں اپنی جان اور اپنے جسم کو کسی ظاہری اور باطنی آفت و مصیبت سے ہرگز نہیں بچا سکتا۔ میں انتہائی عاجز، بے بس اور سراپا احتیاج ہوں، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ یہی کیفیت و احساس، شان بندگی اور کمال عبدیت ہے اور یہی بندے سے اللہ کو مطلوب ہے۔ اسی لیے بندے کی یہ دعا کہ پروردگار دنیا اور آخرت میں سلامتی اور عافیت عطا فرما، بندے کی وہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اس دعا کی توفیق اس بندے کو نصیب ہو سکتی ہے جس کو اپنے عجز و تذلل کا واقعی احساس ہو اور ایسا ہی بندہ خدا کی رحمت و نوازش بیکراں کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو اللہ کے رسولؐ نے اپنے لفظوں میں یوں واضح فرمایا کہ تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا، یعنی دعا کرنا نصیب ہو گئی، اس کے لیے اللہ کی رحمت و کرم کے دروازے کھل گئے۔ لہٰذا ہر بندہ مومن کو رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ جیسی جامع دعا کو اپنے معمول کا حصہ بنا لینا چاہیے (محمد یوسف اصلاحی)۔

## شہیدوں کی تدفین

س : میرا تعلق آزاد کشمیر کے سرحدی گاؤں نبڈالہ سے ہے جہاں ۱۹۹۸ء میں بزدل بھارتی فوج نے چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں آکر سوئے ہوئے ۲۲ افراد' معصوم بچے' بوڑھے' عورتیں اور جوان سب کو ذبح کر دیا تھا۔ مذکورہ واقعے میں سے ایک خاندان جماعت سے وابستہ تھا۔ دشمن کی کارروائیاں سرحدی عوام پر بھی ہوتی رہتی ہیں۔ ہر روز یا ہر ہفتے دشمن کی گولیوں یا گولوں سے مسلمان جو اپنے گھروں کے اندر ہوں یا باہر کھیتوں میں کام کر رہے ہوں یا آجا رہے ہوں' نشانہ بنتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں کوئی آدمی زخمی یا پھر فوت ہو جاتا ہے۔ اس موت کی صورت میں متوفی کی میت کے غسل و کفن وغیرہ کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ کیا ایسے وفات پانے والے شخص کو غسل یا کفن دیا جائے گا یا نہیں؟ غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

ج : آپ کا خط پڑھ کر حالات کا علم ہوا۔ کفار جو ظلم کر رہے ہیں' اس کا وبال ان پر دنیا میں بھی پڑے گا اور آخرت میں بھی وہ اس کا پورا پورا مزہ چکھ لیں گے' ان شاء اللہ! امید ہے کہ آپ لوگوں کو استقامت کے ساتھ میدان میں کھڑا رہنے اور قربانیاں پیش کرنے پر اللہ رحمٰن و رحیم کی جناب سے عظیم الشان جزا ضرور ملے گی' دنیا میں فتح کی صورت میں اور آخرت میں جنت الفردوس میں بلند درجات کی شکل میں۔ اللہ تعالیٰ اس خاندان پر جسے رات کی تاریکی میں درندگی کے ساتھ ذبح کر دیا گیا' مغفرت اور رحمت کی بارش برسائے اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے سرفراز کرے۔ اور جماعت جو خدمت کر رہی ہے اسے قبول فرمائے (آمین)۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی فریاد سنے گا اور انھیں آزادی کی نعمت سے سرشار فرمائے گا۔

۱- آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ جو مسلمان کفار کے ہاتھوں قتل ہوں اور موقع پر شہید ہو جائیں' انھیں ان کے کپڑوں میں دفن کیا جائے گا اور غسل نہیں دیا جائے گا۔ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ ان کے جسم سے شلوار اور قمیص کے علاوہ زائد کپڑوں اور ہتھیاروں کو اتار لیا جائے گا۔ جسم یا کپڑوں پر کوئی گندگی لگی ہوئی ہو' تو اسے بھی صاف کر دیا جائے گا لیکن شہادت کے خون کو صاف نہیں کیا جائے گا۔ اگر زخمی ہونے کے بعد ہسپتال یا گھر میں لایا گیا اور اسے دوا یا غذا دی گئی ہو اور اس کے بعد وفات ہوئی ہو تو پھر اس کو غسل دیا جائے گا اور نئے کفن میں دفن کیا جائے گا (عالمگیری' درمختار' ہدایہ)۔ اس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ہے۔ آپؐ نے شہدائے احد کو بغیر غسل کے ان کے جسموں اور لباس پر لگے ہوئے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا تھا۔ اَمَرَ بِدَفْنِهِمْ بِدِمَآئِهِمْ وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُغَسِّلُوا

(صحیح بخاری، باب من لم یرغسل الشہداء، کتاب الجنائز، باب الصلوۃ، علی الشہید ص ۱۷۹، ایضاً، کتاب المغازی، باب من قتل من المسلمین یوم احد) آپؐ نے ان کو ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا، ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی (الگ الگ نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ اجتماعی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ دس دس آدمیوں کی نماز جنازہ پڑھائی گئی تھی، اس طرح سات جنازے ہوئے تھے) اور انھیں غسل نہیں دیا گیا تھا۔

۲- غائبانہ نماز جنازہ اختلافی مسئلہ ہے۔ احناف کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ نہیں ہے۔ امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ جائز ہے۔ اہل حدیث حضرات کے نزدیک بھی غائبانہ نماز جنازہ جائز ہے۔ اختلافی مسائل میں سختی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر حنفی یا اہل حدیث غائبانہ نماز جنازہ پڑھیں تو انھیں منع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اختلافی مسائل میں شریعت کا یہی مزاج ہے۔

۳- ایک شہادت تو وہ شہادت ہے جو فی سبیل اللہ حاصل ہو، کفار کے ہاتھوں مسلمان قتل ہو جائے۔ دوسری شہادت جو شہادت فی سبیل اللہ کے حکم میں ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو ظلماً قتل کیا جائے اور اس کے قتل پر دیت واجب نہ ہو بلکہ قصاص واجب ہو مثلاً ڈاکو، باغی یا دوسرے ظالم دہشت گرد کسی کو قتل کر دیں تو وہ بھی شہید کے حکم میں ہو گا۔ اسے بھی غسل نہیں دیا جائے گا اور اسی لباس میں دفن کیا جائے گا جس میں قتل ہوا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلشُّهَدَآءُ خَمْسَةٌ اَلْمَطْعُوْنُ وَالْمَبْطُوْنُ وَالْغَرِقُ وَصَاحِبُ الْهَدْمِ وَالشَّهِيْدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ”شہدا پانچ ہیں: طاعون کی بیماری سے اور اسہالوں کی بیماری سے فوت ہونے والا، ڈوب کر مرنے والا، گر کر مرنے والا اور شہید فی سبیل اللہ“ (یہ سب شہید ہیں)۔ بعض روایات میں جل کر مرنے والے کو بھی شہید کہا گیا ہے۔

ان احادیث سے مراد یہ نہیں ہے کہ انھی بیماریوں اور حادثات سے مرنے والے شہید ہیں بلکہ اس طرح کی دوسری غیر معمولی تکلیف دہ بیماریوں اور حادثات سے مرنے والے بھی شہید شمار ہوں گے جیسے ایک حدیث میں عورت کو جو ولادت کی تکلیف سے مرجائے، شہید کہا گیا ہے۔ والمراۃ تموت بجمع شہیدۃ لیکن شہدا کی یہ قسمیں صرف اخروی ثواب میں شہید ہیں۔ غسل، کفن، دفن اور دیگر احکام میں وہ شہید نہیں ہیں۔ واللہ اعلم! (مولانا عبدالمالک)۔

---

# کتاب نما

**آزادی فکر و نظر اور اسلام**، سلطان احمد اصلاحی۔ ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ۔ تقسیم کار: مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، نئی دہلی۔ صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: ۴۰ روپے۔

خردافروزی، احترام انسانیت، حقوق نسواں وغیرہ ایسے موضوعات ہیں، جن پر سیکولر قوتوں نے اس طرح اجارہ داری قائم رکھنے اور مخالفین کے خلاف جارحانہ پراپیگنڈا کرنے کا وطیرہ اپنا رکھا ہے کہ عام طور پر دردمند مسلمانوں کے ہاں گاہے خجالت اور بعض اوقات مداہنت کے رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کمزوری کا سبب علوم اسلامیہ کے بنیادی سرچشموں تک نارسائی اور خزانہ ایمان و عمل سے تہی دامنی ہے۔ اسی لیے حریت فکر کے حوالے سے جب اسلام کی بات ہوتی ہے تو ہمارا دانش ور طبقہ دفاعی پوزیشن اختیار کرتا نظر آتا ہے، حالانکہ قرآن و سنت، انسان کو حریت فکر پر ابھارتے ہیں۔ البتہ خالق کائنات نے اولاد آدم کے لیے چند حدود کا تعین فرما دیا ہے۔ ان حدود کے ساتھ وہ بقیہ تمام امور میں اسے پوری آزادی عطا کرتا ہے۔

سلطان احمد اصلاحی تحقیق و جستجو کے لیے ایسے مشکل موضوعات پر طبع آزمائی کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ان کی اسی جرأت اظہار کی ایک تصویر زیر تبصرہ کتاب ہے۔

مصنف نے صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ: "جہاں تک بے قید اور بے لگام آزادی فکر و نظر کا سوال ہے تو اسے اسلام خود اپنے ماننے والوں کو دینے کا قائل نہیں" (ص ۱۲۰)۔ جس طرح کہ "قرارداد مقاصد" اہل پاکستان کو اللہ تعالیٰ کی نیابت میں کاروبارہ ریاست چلانے کی پابند بناتی ہے، یا پھر خود مغرب، ہر فرد کو پوری آزادی دینے کے باوجود اس بات کی آزادی نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے فرد کو قتل کرے، اپنے ملک سے غداری کرے یا ریاست کا ٹیکس چوری کرے۔ گویا ہر معاشرہ اور ہر نظم مادر پدر آزاد نہیں، مگر جب اخلاقی حدود کے حوالے سے اسلام کوئی قدغن لگاتا ہے تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ: "اسلام میں حریت فکرو نظر نہیں"۔ یہ دانستہ شرانگیزی ہے۔

کتاب اپنے موضوع پر مفید ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ کتاب اپنے موضوع پر مزید تحقیق و تالیف کے لیے اسلامی دانش وروں کو دعوت کلام بھی دیتی ہے (**سلیم منصور خالد**)۔

**مولانا محمد علیؒ** - ایک مطالعہ، عبداللطیف اعظمی۔ ناشر: ایچ-وائی پرنٹرز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، پوسٹ بکس ۸۴۳، لاہور۔ صفحات: ۱۷۴۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

زیر نظر کتاب مولانا محمد علی جوہر کی عظیم شخصیت اور ان کی گراں بہا خدمات پر معروف اور غیر معروف اہل قلم کے مضامین اور تاثرات کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر نصف صدی قبل تحریر کیے گئے تھے۔ مولف نے تلاش و جستجو کے بعد اور بعض غلطیوں کی درستی اور اپنے چند مضامین کے اضافے کے ساتھ انھیں مرتب کر دیا ہے۔ نیز حواشی اور حوالے فراہم کر کے اس کی افادیت کہیں زیادہ بڑھا دی ہے۔

برعظیم کی جدوجہد آزادی نیز عالم اسلام کے لیے، مولانا محمد علی جوہر نے جو عظیم الشان خدمات انجام دیں اور جس عزیمت کا مظاہرہ کیا وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔ یہ کتاب مولانا کی شخصیت اور ان کی جدوجہد پر روشنی ڈالتی ہے۔

مولانا محمد علی کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی غیر معمولی ذہنی اور دماغی رفعت، انسانی ہمدردی، وسعت قلب و نظر، دوسروں کا احترام، ضرورت مندوں کی حاجت روائی، دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ وفاشعاری، سخاوت اور سیرچشمی کی آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ ان کا سب سے بڑا وصف ان کا خلوص تھا جس میں وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں اور ممتاز تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ مصلحت بینی سے وہ کوسوں دور تھے۔ ان کی جرأت اور بے باکی کا تو سارا زمانہ ہی معترف تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جنگ آزادی کی پوری تاریخ میں ان جیسے جری اور بے خوف لیڈر بہت کم ہوں گے۔ یوں تو مجاہدین آزادی کی صفوں میں بہت کم ایسے رہنما تھے جو وقت آنے پر اپنی پارٹی، اپنی قوم، یہاں تک کہ دوست احباب اور عزیز و اقارب کو بھی انصاف کے معاملے میں کھری کھری سنانے کی ہمت رکھتے ہوں۔ یہ نمایاں جرأت اگر کسی میں سب سے زیادہ تھی تو وہ محمد علی جوہر تھے۔ ان کے یہ اشعار ان کے عقیدے، یقین اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

صحافت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بغیر کسی عقیدے کے اخبار نویسی محض دکان داری ہے۔ اخبار کا کام رائے عامہ کی رہنمائی کرنا ہے نہ کہ اس کی تقلید۔ وہ اس طریقے کو معیوب سمجھتے تھے کہ اخبار کی کامیابی اور اخبار کو ہردلعزیز بنانے کے لیے پڑھنے والوں کے خیالات کی تائید کی جائے۔ اس اصول کی خاطر انھوں نے ہمدرد کی عام مقبولیت کو نقصان پہنچانا گوارا کیا لیکن اپنے عقائد کی انفرادیت کو متاثر کر کے

ثقافت کے نام پر نئے دور کے کتنے ہی نغمے الاپ لیے جائیں، قرآن کے زندگی بخش پیغام کی ضرورت ہر حال میں باقی رہے گی، چاہے اکیسویں صدی ہو یا بعد میں آنے والی کوئی بھی صدی۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام اور قرآن کی تعلیمات کو قدیم اور فرسودہ کہنے والے یا تعصب کا شکار ہیں یا غفلت کا، اسلام کبھی بھی زمانے کے اتار چڑھاؤ اور تہذیب کے عروج و زوال سے قدیم نہیں ہو سکتا جس طرح پانی اور ہوا قدیم نہیں ہو سکتے۔

مصنف نے مختلف اشکالات اور مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک مستحسن کام ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ جہاں جہاں جنسی آزادی، منشیات، مادہ پرستی اور دنیاوی نعمتیں عروج پر ہیں وہاں نفسیاتی عوارض بھی بے انتہا ہیں۔ ان کا علاج قرآن حکیم کی بتائی ہوئی راہ ہدایت کو اختیار کرنے ہی سے ممکن ہے۔

مصنف کا یہ طویل اور محنت طلب کام، ان کی عمر عزیز کے بڑے حصے کا ماحصل ہے اور انھوں نے یہ کام اجر آخرت کی نیت سے کیا ہے۔ یہ توجہ دلانا ضروری ہے کہ کتاب کے مباحث میں فرامین رسولؐ کی بے انتہا کمی محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کا طرز عمل بھی قرآن کی آفاقی تعلیمات کو سمجھنے کے اہم ستون ہیں۔ ہدایت اور رہنمائی کے ان دو مددگار مصادر سے بے نیاز رہنا مناسب نہیں ہے۔ حدیث رسولؐ کی دائمی اور قانونی حیثیت سے ہر مسلم آگاہ ہے۔ دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ اگرچہ اس کتاب میں چار درجن سے زیادہ موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے، تاہم قرآن اور سائنس، قرآن اور تہذیب اور قرآن اور دور ابلاغ جیسے موضوعات پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ طباعت و اشاعت کا معیار عمدہ ہے (محمد ایوب منیر)۔

**شعلہ گفتار**، محمد منیر افضل۔ ناشر: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۳- ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور / ۱۰- چیٹرجی روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۳۳، مجلد۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

اس کتاب میں اسلام، پاکستان، جہاد کشمیر، نوجوان نسل اور دور جدید کے حوالے سے ۱۳ تقاریر شامل ہیں۔ انسانوں کا باہمی رابطہ گفتگو اور کلام کے ذریعے ہی ہوتا ہے لیکن خطابت، تقریر اور فصاحت کے ذریعے ذہنوں پر غیر معمولی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ رسول گرامیؐ کا بھی ارشاد ہے کہ میں عربوں میں سب سے فصیح انسان ہوں۔ امت مسلمہ حق بات کہنے اور برائی سے روکنے والے گروہ کا نام ہے۔ بڑی بڑی مجلسوں سے خطاب اور ذہنی تربیت کا کام عرصۂ دراز سے علما کا رہا ہے۔ نامور جرنیلوں اور سپہ سالاروں نے بھی اپنی تقاریر کے ذریعے پورے کے پورے مجمع کو میدان جہاد و قتال میں کود پڑنے کے لیے تیار کیا اور جنگوں کے پانسے پلٹ دیے۔ عرب و عجم کے بعد برعظیم میں بھی نامور مقررین، خطبا اور شہباز ہائے خطابت

قومی اُفق پر چمکے۔ ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، بہادر یار جنگ، علامہ عطا اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری کے نام اس سلسلے میں نمایاں ہیں۔

محمد منیر افضل طالب علمی کے زمانے سے تقریریں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی میں طالب علم راہنما کے طور پر خاصی شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی چند اہم تقاریر کو مرتب کر دیا ہے۔

کتاب میں بعض مشاہیر علامہ عنایت اللہ مشرقی، پیر کرم شاہ الازہری، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، عطا اللہ شاہ بخاری، طارق بن زیاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، نواب بہادر یار جنگ، مولانا محمد علی جوہر، سردار عبدالرب نشتر اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اہم ترین تقاریر کے اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان اقتباسات کا اپنا ایک حسن ہے، تاہم مناسب ہوتا کہ یہ اقتباسات کتاب کے آخر میں یکجا کیے جاتے۔ مزید برآں تمام تقاریر سے قبل اشعار یا قطعات الگ صفحے بنا کر شامل کیے گئے ہیں، یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ اشعار تقریر کا حصہ ہیں یا صرف قارئین کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنے کے لیے شامل کیے گئے ہیں۔

ان تقاریر میں لفظ زندگی اور جوش عمل کی تکرار ہے جو ثابت کرتی ہے کہ مصنف قوموں کی عروق مردہ میں زندگی اور توانائی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ گرد وپوش خوب صورت اور طباعت معیاری ہے (م-ا-م)۔

**نگری نگری پھرا مسافر**، حافظ محمد ادریس۔ ناشر: مکتبہ احیاے دین، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۳۶۳۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

حافظ محمد ادریس صاحب اسلامی تحریک کے اہل قلم اصحاب میں اس اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں تنظیمی ذمہ داریوں اور دوروں اور تقریروں کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ قرطاس و قلم سے اپنا رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ ان کی قلمی کاوشیں بھی متنوع ہیں۔ تاریخ، ترجمہ، افسانہ، مضمون اور سفرنامہ وغیرہ--- سفرنامہ افریقہ (حضرت بلال ؓ کے دیس میں) کے بعد ان کا زیر نظر سفرنامہ عرب و غرب "نگری نگری پھرا مسافر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نام کے سلسلے میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ اس کا دوسرا حصہ (گھر کا رستہ بھول گیا) مجھ پر صادق نہیں آتا۔ میں نے دنیا بھر کی سیر کی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا مگر اللہ کا شکر ہے کہ گھر کا راستہ کبھی نہیں بھولا۔ دنیا میں جتنے بھی جنت نظیر خطے ہیں، دل کو اچھے لگتے ہیں مگر اپنے وطن کی خاک" حرمین شریف کے استثنیٰ کے ساتھ، ہر ایک سے زیادہ محبوب و حسین لگتی ہے"۔ اس کا ہر ذرہ خاک ہمیں اپنی جان سے عزیز تر ہے۔ یہاں ہم جیل میں بھی پُرسکون رہتے ہیں کہ زنداں میں بھی امید کے چراغ جلتے رہتے ہیں۔

زیر نظر سفرنامے میں بعض خلیجی ریاستوں (قطر، ابوظہبی، کویت)، سعودی عرب اور ناروے کے متعدد

اسفار کا تذکرہ شامل ہے۔ یہ اجزا ہفت روزہ "ایشیا" اور روزنامہ "انصاف" کے سنڈے میگزین میں چھپتے رہے۔ سفرنامہ مجموعی طور پر حافظ صاحب کے طوفانی دوروں کی روداد یا روزنامچے پر مشتمل ہے۔ مشاہداتی بیانات اور تفاصیل کے بجائے انھوں نے تذکرہ احباب و اجتماعات اور ملاقاتوں کے ذکر کو ترجیح دی ہے۔ ان کے اپنے بقول: "اپنے تخیلات' تصورات اور احساسات سے تصویر بنانے یا نتائج اخذ کرنے سے زیادہ مسافر نے جو کچھ دیکھا' بلاکم و کاست بیان کر دیا ہے اور---- تخیلات و تصورات کو جھٹک کر محض واقعات کو بیان کرنے پر اکتفا کیا" (پیش لفظ از مصنف)۔

بیرونی ممالک میں اہل وطن اور وابستگان اسلامی تحریک کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اس لیے مسافر' وطن سے دور ہوتے ہوئے بھی خود کو اہل وطن کے درمیان محسوس کرتا ہے۔ مزید برآں وہ وقتاً فوقتاً وطن کو کسی نہ کسی بہانے یاد کرلیتا ہے۔ بعض باتیں بہت دل چسپ ہیں' مثلاً: ناروے کے بادشاہ میں بادشاہوں والی کوئی بات نہیں۔ وہ عام گاڑی میں سفر کرتا ہے اور بسااوقات خود ہی خرید و فروخت کے لیے بازار چلا جاتا ہے اور جنرل اسٹور میں بے تکلفی سے داخل ہو جاتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ ناروے کے عوام دل سے بادشاہ کی عزت کرتے ہیں (ص ۱۴۲)۔

ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ ناروے کی حکومت زیادہ بچوں والے خاندان کو زیادہ مراعات دیتی ہے' نہ صرف بچوں کو وظیفہ ملتا ہے بلکہ دیگر اخراجات کے لیے حکومت کی طرف سے مدد اور رعایتیں دی جاتی ہیں (ص ۱۸۴)۔ حافظ صاحب ناروے کے وزیر انصاف سے ملنے گئے تو پتا چلا کہ وہ وزیر عام ٹرام کے ذریعے دفتر پہنچے ہیں کیوں کہ ڈرائیور چھٹی پر تھا اور وزیر صاحب کے پاس نہ ذاتی گاڑی ہے اور نہ وہ ڈرائیونگ لائسنس رکھتے ہیں (ص ۱۷۵)۔ یہ کیسی عبرت ناک بات ہے کہ ناروے دنیا کے مال دار ترین ملکوں میں سے ہے مگر وہ اپنے حکمرانوں کو وہ مراعات نہیں دیتا جو غریب مشرقی ممالک کے حکمرانوں نے (جیسے پاکستان میں) اپنے لیے مختص کر رکھی ہیں۔

سفرنامے میں متعلقہ علاقوں اور ممالک کے مسائل کا ذکر بھی آیا' مثلاً عرب ریاستوں کی معاشی خوش حالی میں کمی' اقتصادی کساد بازاری' امریکی فوجوں کی موجودگی' مقامی آبادیوں اور تارکین وطن کے مسائل اور حکمرانوں کے معاملات وغیرہ---- ان میں بہت سے پہلو پریشان کن ہیں' مگر حافظ صاحب کہتے ہیں کہ میری فکر اور سوچ پر رجائیت غالب رہتی ہے' چنانچہ وہ رفقا کو پُرامید رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ کتاب میں متعدد نقشے بھی شامل ہیں۔ قیمت کے لحاظ سے کتاب ارزاں ہے (رفیع الدین ہاشمی)۔

# مدیر کے نام

**جیلانی کامران، لاہور**

"مسلم معاشرہ، خاندانی منصوبہ بندی اور معاشی ترقی" (اگست ۲۰۰۰ء) میں آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے خاندان کے بنیادی حق کا ذکر کیا ہے۔ حکومت اور عطیہ عنایت اللہ اور این جی اوز کے حوالے سے جس مغربی ثقافتی یلغار کا تذکرہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ گذشتہ دنوں یہاں امریکہ سے پروفیسر آغا خالد سعید تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک لیکچر میں بتایا کہ امریکی ریاست کیلی فورنیا میں سفید فام آبادی کے مقابلے میں غیر سفید فام لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ۲۰۰۳ء تک کیلی فورنیا میں غیر سفید فام باشندوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ مغربی تہذیب کے دانش وروں کے اندیشے اپنی کم شرح تولید کے بارے میں ہونے چاہییں نہ کہ دنیا بھر کی ماؤں کو بانجھ بنانا ان کا مطمع نظر ہونا چاہیے۔ اگر ضبط تولید کو زبردستی کمزور اور مفلس گھرانوں میں ٹھونسا جائے تو یہ گھرانے کے تقدس کی پامالی ہوگی۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی مغربی رویوں کے آگے جھکنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہر معاشرتی مسئلے کا حل مسلم تہذیب کے دائرے میں ہونا ضروری ہے۔ لیکن بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ مسلم تہذیب کے نمایندے بھی جبر اور یک طرفہ انداز فکر کو نافذ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ میں آپ کی تحریروں کا مداح رہا ہوں اور خاص طور پر اسلوب کا۔ جو معیار ترجمان القرآن نے اپنایا ہے وہ اردو ادب کی مذہبی نثر کے لیے ایک تاریخ ساز سرمایہ ہے۔

**صابر نظامی، قصور**

پروفیسر عبدالمغنی کے مضمون "مستقبل کا منظرنامہ" (اگست ۲۰۰۰ء) میں مستقبل کے عروج و زوال کی ایک پوری داستان ہے اور کچھ پیش گوئیاں بھی کی گئی ہیں۔ لکھا ہے: "اقبال کی نظم اور مودودی کی نثر آج کی دنیا کی بہترین نظم و نثر ہے۔ دونوں پر قرآن مجید کے لافانی اعجاز بیان کا پرتو ہے"۔ کیا ہی اچھا ہو کہ علامہ اقبال کے لٹریچر کو تحریک اسلامی کے لٹریچر میں شامل کیا جائے اور فارسی لٹریچر کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ علامہ صاحب کی کتاب علم الاقتصاد اسلام کے معاشی نظام کے لیے راہنما ہے۔ تشکیل جدید کے بعض مضامین بھی تحریک اسلامی کا سرمایہ ہو سکتے ہیں۔

**خلیل الرحمان، گجرات**

تہذیب جدید یا تہذیب مغرب کے حوالے سے ترجمان القرآن کے مضامین میں کچھ یکسانیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ مغربی تہذیب کے اندر فساد و انتشار کے واقعات، حالات اور مسائل پر تبصرے شائع کیے جائیں، مثلاً اوکلوھوما اور اٹلانٹا میں فائرنگ کے واقعات جیسے عمرانی مسائل پر مقالے شائع کیے جانے چاہییں۔ دل چاہتا ہے کہ ہمارے مصنفین مغربی فلاسفہ کی ریسرچ اور تحقیق، مستقبل کے حالات کی پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اپنی تحقیق اور پیش گوئی کو رواج دیں۔ مغربی نمایندے جان جوکھوں میں ڈال کر خبریں لاتے ہیں، اللہ کرے کہ ایک وقت آئے جب کوئی بڑی اسلامی نیوز ایجنسی بنے اور کوئی ٹی وی چینل میسر آسکے جس سے دنیا کے سامنے اصل حالات اور واقعات آسکیں۔

**محمد اسلم اعوان، گوجرانوالہ**

"شفاخانے، مسلمانوں کی طبی خدمات" (جولائی ۲۰۰۰ء) بہت کھٹکتا ہے۔ ایسے مضامین کی جگہ "ہمدرد صحت" جیسے طبی رسالہ جات ہیں نہ کہ فکر اسلامی اور احیاے اسلام کے لیے مختص جرائد---!

**ناصر علی خان، بریکوٹ، سوات**

"شفاخانے" (جولائی ۲۰۰۰ء) کی یہ معلومات کہ صحت یابی کے بعد مریضوں کو سفر خرچ کے علاوہ طاقت کی بحالی اور روزگار کے حصول تک شفاخانوں سے وظیفہ ملتا تھا، بڑی دل لگتی ہیں۔ اگر مزید تفصیلات سامنے آتیں تو ہمارا سر فخر سے مزید بلند ہو جاتا کہ مسلمانوں نے وہ خدمات انجام دی ہیں جو مغرب ۲۱ ویں صدی میں بھی انجام نہیں دے سکا ہے۔

**محمد قاسم، گوجر خان**

"مخلوط انتخاب اور خاندانی منصوبہ بندی" جیسے موضوعات پر **ترجمان القرآن** نے قلم اٹھا کر قوم کا حق نصیحت ادا کیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے سرکاری پالیسی پر علما کا بھی وہ ردعمل نہیں آیا جو آنا چاہیے تھا۔ اس ضمن میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ پہلی بار سامنے آئی ہے۔ حکومت اپنے اس ادارے سے ہی رہنمائی حاصل کرے!

**عبدالجبار شاکر، لاہور**

انفارمیشن ٹکنالوجی کی اہمیت اور اثرات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ حکومت بھی اس طرف بھرپور توجہ دے رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے پیش آنے والے حالات کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر مربوط، موثر اور مدلل انداز میں پیش کیا جائے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ کے رسالے میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے حوالے سے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جائے جس میں قدیم و جدید اہل علم حصہ لیں۔

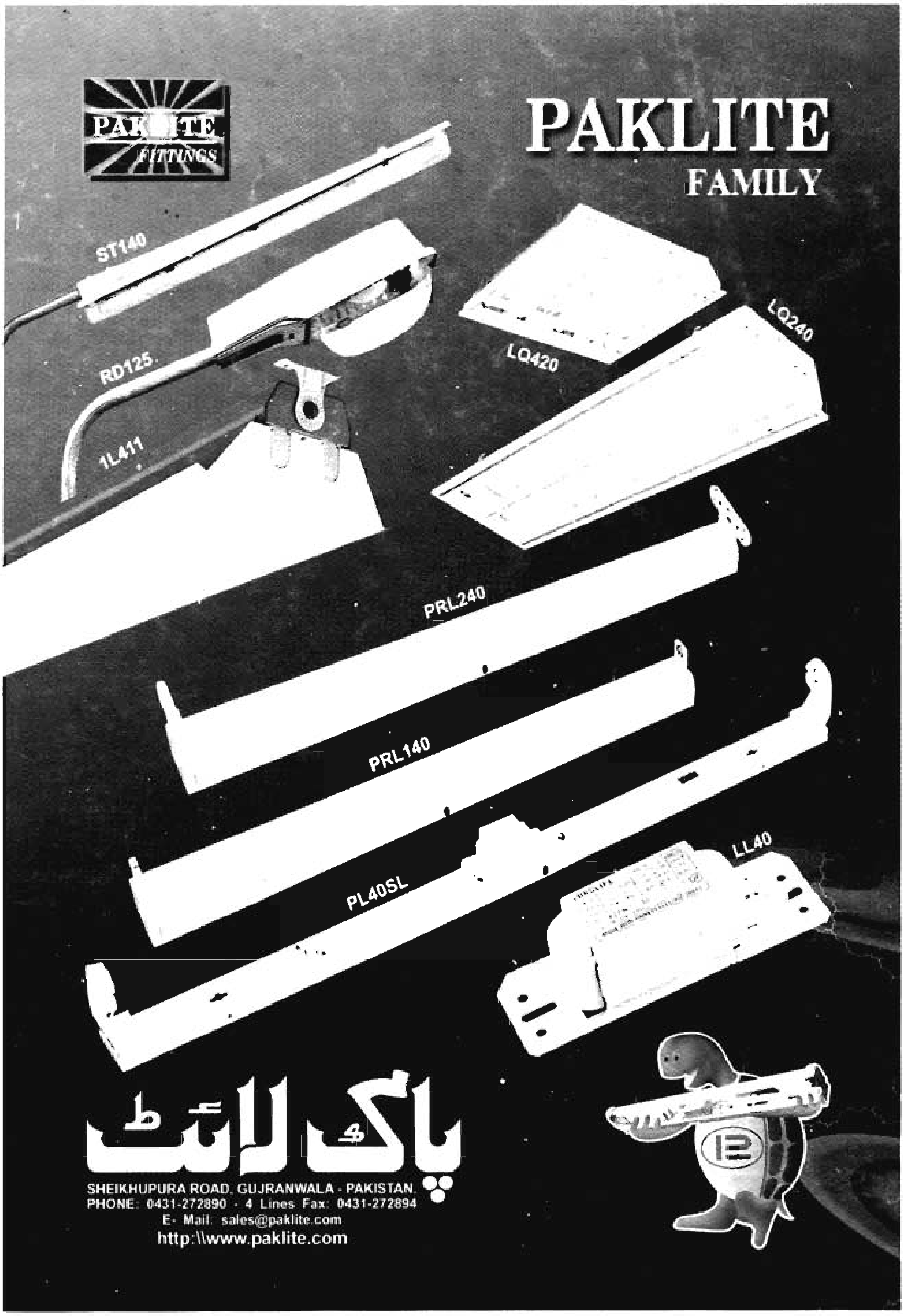
---

حسین فاروق مودودی نے ملک عبد محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا

C .P.L. 236

*Phone : 7587916*
*7585590*

*Monthly* **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.



C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.

